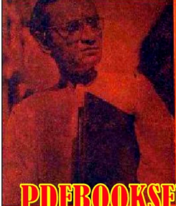

PDFBOOKSFREE.PK

منٹو: میرا دشمن

اوپندر ناتھ اشک

منٹو: میرا دشمن

اوپندر ناتھ اشک

جمشید کتاب گھر
حیدر آباد

منٹو : میرا دشمن

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

جملہ حقوق محفوظ

طبع اول : ۵۰۰
ناشر : اویس شجاع طاہر
پریس : ایس - ٹی - پرنٹرز ، حیدرآباد

اُن عقلمندوں کے نام
جنھوں نے اس مقالے کو منٹو کے خلاف سمجھا

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

گزارشِ احوال

"میرے اصلاح خانے میں کوئی شالد نہیں، کوئی کنگھی نہیں کوئی شیمپو نہیں، کوئی گھونگھر پیدا کرنے والی مشین نہیں ۔ میں اپنا بناؤ سنگار کرنا نہیں جانتا ۔ آغا حشر کی بھینگی آنکھ مجھ سے سیدھی نہیں ہو سکی ۔ اُس کے منہ سے گالیوں کے بدلے میں پھول نہیں جھڑا سکا ۔ میراجی کی غلاظت پر مجھ سے استری نہیں ہو سکی اور نہ ہی میں اپنے دوست شیام کو مجبور کر سکا کہ وہ برخود غلط عورتوں کو سالیاں نہ کہے ــــ اس کتاب میں جو بھی فرشتہ آیا ہے اُس کا باقاعدہ مونڈن ہوا ہے ۔ اور یہ رسم میں نے بڑے سلیقے سے ادا کی ہے ۔"

یہ سطریں منٹو کی کتاب 'گنجے فرشتے' کی آخری سطریں ہیں ۔ 'گنجے فرشتے' میں پاکستان کے قائد اعظم محمد علی جناحؒ سے لے کر "فلم انڈیا" بمبئی کے ایڈیٹر شری بابو راؤ پٹیل تک ــــ منٹو نے ان لوگوں کی یادیں قلمبند کی ہیں جن سے وہ اپنی زندگی میں ملا یا جن کے ساتھ اس نے کچھ وقت گزارا ۔ چونکہ ان مضامین پر پاکستان کے دقیانوسی حلقوں میں بہت شور و غوغا بلند ہوا اس لیے جب منٹو نے انھیں اپنی کتاب 'گنجے فرشتے' میں یکجا کیا تو آخر میں اپنی صفائی میں ایک مضمون بھی لکھا، جس کی آخری سطور کا اقتباس میں نے اُوپر دیا ہے ۔

یہ سطریں منٹو کے مضامین کی طرح اُس کی صاف گوئی، بے باکی اور پھکڑ پنے کی شاہد ہیں ۔ جن لوگوں نے اُسے کچھ دیر کے لیے بھی دیکھا یا اُس سے باتیں کیں وہ بین السطور منٹو کو اُس کی تمام تر جھلاہٹ اور تیکھے پن کے ساتھ دیکھ سکتے ہیں ۔ منٹو نے اپنے جگری دوست شیام یا اپنے قابلِ تعظیم استاد صفت دوست جناب باری یا پھر پاکستان کے بانی محمد علی جناحؒ کے بارے میں بھی لکھا تو اسی صاف گوئی اور بے باکی سے کام لیا ۔

منٹو میرا دشمن تھا ــــ یہ بات ہرگز مجھے اپنے قلم سے نہ لکھنا پڑتی اگر دوستوں نے اس بات کی تشہیر نہ کر دی ہوتی اور کرشن چندر (ایم - اے -) نے منٹو سے متعلق اپنا مضمون لکھتے ہوئے منٹو کی زندگی ہی میں لوگوں کے اس شک پر یقین کی مُہر ثبت نہ کر دی ہوتی ۔

۱۹۵۵ء میں، منٹو کی وفات کے بعد، میرے پاس خط پر خط آنے لگے کہ میں منٹو کے بارے میں کچھ ضرور لکھوں کہ میں نے اس کے ساتھ کئی برس گزارے تھے، میرے ساتھ اس کی دوستی بھی رہی تھی اور دشمنی بھی اور میں منٹو کے کردار پر نزدیک سے روشنی ڈال سکتا ہوں ۔

یہ عجیب بات ہے کہ دنیا کے سٹیج سے منٹو کے جاتے ہی ان لوگوں میں بھی، جنھوں نے اس کی زندگی میں اپنے دروازے اس پر بند کر رکھے تھے، اُس کے لیے عجیب سا پیار اُمڈ آیا ۔ پاکستان ریڈیو نے منٹو کی تخلیقات کو نشر کرنا بند کر دیا تھا ۔ بہانہ خواہ کچھ بھی بنایا گیا ہو ــــ ملک کی تقسیم کے خلاف اس کا کوئی مضمون یا مسلم لیگ کے خلاف اس کی کوئی کہانی یا پھر پاکستان میں اس کے کسی افسانے کے خلاف چلنے والا کوئی مقدمہ ــــ لیکن حقیقت یہ تھی کہ پاکستان ریڈیو کے ڈائریکٹر جنرل (یا جو بھی یہ عہدہ اس وقت وہاں کہلاتا ہو -) جناب زیڈ - اے - بخاری (جو زیڈ - اے - بی - یا چھوٹے بخاری کہلاتے تھے -) ذاتی طور پر اس سے خار کھائے ہوئے تھے ۔

میں نے پاکستان ریڈیو پر منٹو کی تخلیقات کے خلاف پابندی کا ذکر سنا تو میری آنکھوں کے سامنے ملک کی تقسیم سے پہلے بمبئی کی ایک شام گھوم گئی جب چھوٹے بخاری صاحب نے (جو اس وقت آل انڈیا ریڈیو، بمبئی کے سٹیشن ڈائریکٹر تھے، ولایتی کپڑے ترک کر کے کھادی کی بشرٹ پہننے لگے تھے اور ایک وقت کانگرس اور مسلم لیگ لیڈروں سے ساز باز کیے ہوئے تھے -) مجھے، کرشن اور منٹو کو ریڈیو سٹیشن پر ایک شام گزارنے کی دعوت دی تھی ۔ بہانہ یہ تھا کہ باہمی گفتگو کے بعد ریڈیو پروگراموں کو نیا رنگ دیا جا سکے ۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے، کرشن اس بحث مباحثے میں تقریباً خاموش رہا تھا لیکن منٹو نے زیڈ - اے - بی کی بے طرح گت بنائی تھی ۔ بخاری

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

صاحب اگرچہ کوچ پر بیٹھے تھے اور ہمارے بیٹھنے کے لیے بھی کوچ موجود تھے لیکن منٹو کوچ پر بیٹھنے کے بجائے اُن کے سامنے غالیچے پر نہایت بے تکلفی سے کہنی کے بل لیٹ گیا تھا اور اس نے انھیں بے نقط سنائی تھیں ۔

بخاری صاحب اس تلخ بحث کو کیوں کر بھولے ہوں گے ، میں یہی سوچتا رہا ۔ اگر کسی بہانے سے بھی انھوں نے ریڈیو پاکستان سے منٹو کا پتا کاٹ دیا تو کوئی عجیب بات نہیں ہوئی ۔ عجیب بات یہ ہوئی کہ جب منٹو ہمیشہ کے لیے دنیا چھوڑ گیا تو ریڈیو پاکستان سے آدھ گھنٹے کا پروگرام نشر کیا گیا ۔ یوں مجھے اس پر بھی حیرت نہیں ہونی چاہیے تھی کیونکہ عظیم لوگوں کے ساتھ بارہا ایسا ہوا کرتا ہے ۔

الہ آباد آنے کے بعد اگرچہ منٹو سے میرا براہِ راست تعلق نہیں رہ گیا تھا لیکن دلوں کا رشتہ ، باوجود تمام تلخیوں کے ، برقرار تھا ۔ اس نے مجھے ایک خط لکھا جس میں مکتبہ جدید، لاہور سے شائع ہونے والے ایک رسالے "اردو ادب" کے لیے مجھ سے افسانہ طلب کیا تھا ۔ میں نے اپنی بیماری اور پریشانی کی بات لکھی تھی جس کے جواب میں اس نے افسوس کا اظہار کیا تھا ، میرے حق میں دعا کی تھی اور دوبارہ افسانہ یا ڈراما بھیجنے کی تلقین کرتے ہوئے وقتاً فوقتاً لکھنے کی تاکید کی تھی ۔ لیکن نہ میں ہی لکھ سکا اور نہ منٹو نے پھر خبر لی ۔ پرچہ بھی شاید نہیں نکلا ۔ نکلا تو میرے پاس نہیں آیا ۔ لیکن یوں میں اُس کی خیر خبر رکھتا رہا ۔ کچھ تو اُس محبت کے باعث جو کوشلیا کو صفیہ بھابی سے تھی اور کچھ اُن شاندار افسانوں کے سبب جو منٹو نے پاکستان جا کر تخلیق کیے ۔

منٹو نے وہاں بہت اذیتیں اُٹھائیں اور شاید اسی لیے بہت اچھی کہانیاں لکھیں ۔ ان میں سے اکثر اسے شراب کی ایک بوتل کا مول بہم پہنچانے کے لیے لکھنی پڑیں ۔ اس سلسلے میں وہ کئی ہفتے تک تقریباً ہر روز ایک افسانہ لکھتا رہا ۔ ظاہر ہے کہ اُن افسانوں کا ادبی معیار منٹو کی طرزِ تحریر کی تمام خوبیوں کے باوجود بلند نہیں رہ سکا لیکن اس دوران اس نے کچھ ایسے افسانے بھی لکھے جو اس کی پہلے کی کہانیوں کے مقابلے میں کہیں برتر اور عظیم تھے اور ان میں جس حقیقت کی عکاسی کی گئی تھی وہ کہیں

گہری اور دل و دماغ کو جھنجھوڑنے والی تھی ۔ "کھول دو" ، "ننگی آوازیں" ، "شریفن" ، "یزید" ، "ٹیٹوال کا کتا" ، "ٹوبہ ٹیک سنگھ" ایسے ہی افسانے ہیں اور مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں کہ دور رہ کر بھی ، میرا نام نہاد دشمن ہوکر بھی اُن افسانوں کے ذریعے منٹو دوسروں کی بہ نسبت کہیں میرے نزدیک آ گیا تھا ۔

اِس بھی انتہائی مصروفیت کے باعث میں کبھی اتنا طویل مضمون قلمبند نہ کرتا اگر مہندر ناتھ مرحوم نے بمبئی سے مجھے یہ نہ لکھا ہوتا کہ میں نے منٹو پر کچھ نہ لکھا تو وہ مجھے کبھی نہ بخشے گا ۔ مہندر ناتھ بمبئی سے "شاعر" کا منٹو نمبر نکال رہے تھے اور انھوں نے بھی مجھ سے مضمون طلب کیا تھا ۔ نہ جانے مہندر کے اس فقرے میں کیسا اصرار تھا یا کیسا طعنہ کہ میں مان گیا اور میں نے جواباً لکھ بھیجا کہ میں اس کے حکم کی تعمیل میں منٹو پر ضرور کچھ لکھوں گا ۔

منٹو کی وفات سے چند ماہ قبل پاکستان سے مکتبہ جدید کے مالک اور میرے پرانے دوست چودھری نذیر احمد کے چھوٹے بھائی چودھری بشیر احمد الہ آباد تشریف لائے ۔ میں نے اُن سے پاکستان جا کر منٹو کی کتابوں کا پورا سیٹ بھیجنے کی فرمائش کی ۔ انھوں نے وعدہ کیا اور پاکستان جاتے ہی بلا تاخیر اُسے ایفا کر دیا ۔ میں نے منٹو کے تمام نئے پرانے افسانے دوبارہ پڑھے ۔ چونکہ میں نے مہندر ناتھ سے مضمون بھیجنے کا وعدہ کر لیا تھا اس لیے جب میں قلم ہاتھ میں لے کر بیٹھا تو ناگہاں دل میں یہ سوال پیدا ہوا کہ میں کیسا مضمون لکھوں ؟ منٹو کی بے وقت موت پر غم و افسوس میں ڈوبا ہوا کوئی ایسا جذباتی مقالہ جیسا کرشن نے "آئینہ" دلی میں "خالی بوتل بھرا ہوا دل" کے عنوان سے لکھا تھا یا کوئی ایسا مضمون جس میں اس کی تمام بلندی اور پستی ، فراخ دلی اور کم ظرفی ، عظمت اور کم مایگی — یعنی اس کی تمام خوبیاں اور خامیاں اُجاگر ہو جائیں ۔ میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ انتہائی خواہش کے باوجود 'گنجے فرشتے' کے مصنف کے بارے میں لکھتے ہوئے میں بددیانتی اور ریاکاری سے کام نہیں لے سکا ۔ میں نے ڈیڑھ ماہ کی متواتر محنت سے یادداشت قلم بند کی اور چونکہ اتنا طویل مقالہ "شاعر" میں شائع نہیں ہو سکتا تھا اس لیے میں نے اسے جناب محمد طفیل کو بھیج دیا اور یہ "نقوش" (لاہور) کے دو

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

شماروں میں چھپا ۔ وعدہ تو انھوں نے یہی کیا تھا کہ اسے ایک ہی شمارے ـــ منٹو نمبر ـــ میں شائع کریں گے لیکن کیا انھوں نے دو شماروں میں ۔ اور ستم ظریفی یہ کہ پہلی قسط کے آخر میں 'مزید اگلے ایشوع میں' یا 'ناتمام' یا کوئی ایسا ہی اشارہ بھی نہیں دیا جس سے معلوم ہو کہ مضمون نامکمل ہے اور اس کا خاتمہ اگلے شمارے میں ہوگا ۔ یہی نہیں بلکہ انھوں نے یہ بھی ظلم کیا کہ اسے دو آزاد مضامین کا روپ دینے کے لیے دو حصوں کو جوڑنے والا ایک نہایت اہم پیرا بھی کاٹ دیا جس کی وجہ سے بہت سے ناظرین نے محسوس کیا کہ میں نے یہ مضمون منٹو سے انتقام لینے کے لیے لکھا تھا ۔ جن ناظرین نے دونوں اقساط نہیں پڑھیں وہ تو آج تک یہی محسوس کرتے ہیں ۔ حالانکہ یہ میرے ساتھ زیادتی تھی لیکن مدیر صاحبان ادیبوں کے ساتھ ایسی زیادتیاں بارہا کیا کرتے ہیں اور مجھے اس کا کافی تجربہ ہے ۔ مجھے صرف اس بات کی خوشی ہے کہ خواہ لکھے جانے کے پورے بیالیس برس بعد ہی سہی ، یہ مضمون اُردو میں اپنے مکمل روپ میں شائع ہو رہا ہے ۔

۱۹۴۶ء میں فلم کی ملازمت سے کچھ روپیہ جوڑ کر جو ادارہ میں لاہور میں شروع کرنا چاہتا تھا ، اور جسے دق کی اپنی بیماری اور تقسیم ہند کے بعد اکھڑ جانے کی وجہ سے میں شروع نہیں کر سکا ، اسے تیس برس بعد ، اگر لاہور میں نہیں تو الہ آباد میں ، میں نے آخر کار شروع کر دیا اور کتابوں کے پہلے سیٹ میں "منٹو : میرا دشمن" شائع ہو رہی ہے ۔ یوں اس کی نوبت بھی شاید ابھی نہ آتی اگر میرے عزیز دوست ڈاکٹر جعفر رضا کی پیہم طعنہ زنی نے مجھے عاجز نہ کر دیا ہوتا ۔ انھوں نے پریم چند پر اپنے مقالے میں مجھے بھی اُن مصنفوں کی صف میں شامل کر لیا جو ہندی سے ناطہ نہ ہونے کے باوجود ہندی کے ادیب سمجھے جاتے ہیں حالانکہ یہ بات صحیح نہیں ہے کیونکہ بقول ان کے اگر میں ہندی نہیں جانتا تو پھر میں اُردو بھی نہیں جانتا ۔ حقیقت یہ ہے کہ میں پنجابی ہوں اور اگرچہ مجھے زبان دانی کا دعویٰ نہیں لیکن دونوں زبانیں میں نے محنت سے سیکھی ہیں اور عملی طور پر دونوں زبانوں میں لکھتا ہوں اور اُردو سے میرا رشتہ کبھی منقطع نہیں ہوا ۔ یہ الگ بات ہے کہ گردشِ دوراں نے مجھے ہندی کی طرف زیادہ متوجہ رکھا ، لیکن اس میں اُردو والوں کا قصور بھی کم نہیں ۔

مضمون میں ایک جگہ منٹو کی تیس کہانیوں کو ہندی میں شائع کرنے کا ذکر ہے ۔ مجھے اس بات کی بھی خوشی ہے کہ اگرچہ اس میں بھی تیس برس لگ گئے لیکن آخر میں نے منٹو سے کیا ہوا اپنا وعدہ پورا کر دیا اور چند برس پہلے منٹو کی بہترین تیس کہانیاں ہندی میں شائع کر دیں جن پر میرے چھوٹے لڑکے نیلابھ نے ایک نہایت زور دار مقالہ لکھا ہے اور سارے ہندی جگت میں جس کا چرچا ہے ۔

یہ مضمون میں نے ۱۹۵۵ء میں لکھا تھا اور اُس برس اُردو ، ہندی کے رسالوں میں شائع ہوا تھا اور اس کا بے حد تیکھا ردِ عمل اس برِ صغیر کے ہندی ، اردو ادیبوں میں ہوا ۔ بعض ناظرین نے اسے بے حد سراہا ۔ دوسروں نے اس کے مصنف کو لائقِ گردن زدنی و سوختنی قرار دیا ۔ آج اتنے برس گزر جانے کے بعد بھی اس کی تعریف یا مذمت میں کوئی نہ کوئی خط آ جاتا ہے ۔ مجھے اس بات کا اعتراف کرنے میں تامل نہیں کہ میرے ناول "گرتی دیواریں" کے بعد میری کوئی تخلیق اتنے متضاد ردِ عمل کی موجب نہیں بنی ۔ جب یہ مضمون "نقوش" میں شائع ہوا تھا تو کراچی سے لے کر کلکتے اور کشمیر سے لے کر حیدرآباد تک اس کے چرچے ہوتے رہے تھے ۔

کرشن چندر نے بمبئی سے لکھا :

> "'منٹو : میرا دشمن' میں اشک نے صداقت اور صاف بیانی کو سامنے رکھا ہے ۔ اس مضمون میں انھوں نے منٹو کی شخصیت کے دونوں پہلو دکھائے ہیں اور اس کے کردار کے مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے ۔ کہیں کہیں وہ اپنی صاف گوئی میں تیکھا لہجہ اختیار کر گئے ہیں ۔ لیکن اشک کا منٹو پر لکھنا ایک تیکھے مزاج والے ادیب کا ایک تیکھے مزاج والے ادیب پر لکھنا ہے اور اس لیے بے حد دلچسپ اور اعلیٰ درجے کا مقالہ ہے ۔"

بیدی (راجندر سنگھ) نے ایک خط میں لکھا :

> "منٹو پر تمھارا مضمون پڑھ کر محسوس ہوا کہ منٹو کے نام نہاد دوستوں کے مقابلے میں تم دشمن ہو کر بھی اس کے کتنے نزدیک ہو ۔"

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

ان تمام خطوط میں، جو مجھے اس مضمون کے سلسلے میں موصول ہوئے، سب سے قیمتی خط صفیہ بھابی (مسز منٹو) کے ہیں۔ پہلے خط میں انھوں نے لکھا:

"...... نقوش میں آپ کا مضمون پڑھا۔ اگرچہ سعادت صاحب کی بہن کو تو پسند نہیں آیا لیکن مجھے اچھا لگا۔ آپ نے سب باتیں سچی سچی لکھی ہیں۔"

میں نے اس کے جواب میں لکھا کہ مضمون نامکمل شائع ہوا ہے۔ پورا چھپ جائے تو پھر اپنے تاثرات دیجیے گا۔ اس بار ۲۷ اگست ۱۹۵۵ء کو صفیہ بھابی کا ایک طویل خط آیا جس میں دوسری باتوں کے علاوہ مضمون کے بارے میں انھوں نے لکھا تھا:

"...... آپ کا بقایا مضمون اب کے "نقوش" میں دیکھا۔ آپ نے بڑا مفصل مضمون لکھا ہے۔ مجھے سارا بہت پسند ہے۔ آپ نے بہت سچی باتیں لکھی ہیں اور آپ کو اور بہن کوشلیا کو سعادت صاحب کا جو دکھ ہوا ہے وہ اس مضمون سے ظاہر ہوتا ہے۔"

تقریباً ایک سال بعد ۱۷ جون ۱۹۵۶ء کو راولپنڈی سے مختار صدیقی کا خط ملا۔ اس میں انھوں نے دوسری باتوں کے علاوہ اس مضمون کا بھی ذکر کیا:

"اس دوران میں آپ کی دو چار چیزیں بھی پڑھیں۔ سب سے ہنگامہ خیز منٹو پر آپ کا مضمون ہے۔ اس کا یہاں بہت تذکرہ رہا ہے۔ لکھنے پڑھنے والوں کا خیال ہے کہ منٹو کے بارے میں جو نہایت رومانی اور ان سنسیر (Insincere) انداز میں مختلف لوگوں نے لکھا ہے وہ سب غیر حقیقی اور مصنوعی ہے۔ کام کی چیز اشک کا مضمون ہے اور بس ......"

ہندی میں یہ ترقی پسندوں کے پرچے "نیا پتھ" میں شائع ہونا شروع ہوا تھا لیکن چند اقساط ہی شائع ہوئی تھیں کہ ایڈیٹروں نے (باوجود وعدہ کرنے کے کہ پورا مضمون شائع ہونے بغیر کسی طرح کا ردِ عمل نہیں دیا جائے گا۔) اس کے خلاف خط چھاپنے شروع کر دیے اور وہ ہنگامہ مچا کہ

خدا کی پناہ! آخر کار انھوں نے اسے شائع کرنا بند کر دیا۔ میں نے ایک تلخ دیباچے کے ساتھ اسے ۱۹۵۶ء میں "نیلابھ پرکاشن" سے شائع کر دیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ آج اتنے برس گزر جانے پر بھی اس مضمون کا ردِ عمل اتنا ہی تیکھا اور متنوع ہے جو آج سے بیس بائیس برس پہلے تھا۔

اوپندر ناتھ اشک

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

منٹو : میرا دشمن

نہیں ، کسی کو تکلیف پہنچانے کے لیے کمینہ بننا ضروری نہیں ، لیکن زندگی کا المیہ یہ ہے کہ بھلے اور شریف لوگ ، جو باہمی محبت کرتے ہیں ، تمام تر نیک خواہشات کے باوجود ایک دوسرے کو سخت صدمے پہنچا سکتے ہیں ۔

آندرے ژید

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

منٹو میرا دشمن سمجھا جاتا تھا ۔ ہم میں خاصی چپقلش رہتی تھی اور اس میں کوئی شک نہیں کہ جب تک ہم اکٹھے رہے ہم نے ایک دوسرے کو سخت چوٹیں پہنچائیں ۔ کتب پبلشرز ، بمبئی سے شائع ہونے والے "نئے ادب کے معمار" کے سلسلے میں سعادت حسن منٹو کا جو اسکیچ کرشن چندر نے لکھا اُس میں اس چپقلش کا ذکر کر دیا اور ہماری یہ دشمنی روایتی ہو گئی ۔ یہاں تک کہ ایک دوست نے اسی دشمنی کا ذکر کرتے ہوئے مجھ سے اصرار کیا کہ اگر میں نے منٹو کے بارے میں مضمون نہ لکھا تو وہ مجھے کبھی نہ بخشے گا ۔ لیکن آج ، جب منٹو اس دنیا میں نہیں ہے ، میں سوچتا ہوں کیا واقعی ہم دشمن تھے ؟ اور پندرہ بیس برسوں کا جائزہ لیتا ہوں تو پاتا ہوں کہ اگر ہمارے تعارف کی ابتدا ہی دشمنی سے نہ ہوتی تو ہم بہت اچھے دوست ہوتے ۔"

منٹو کی اور میری اُفتاد میں زمین آسمان کا فرق تھا ۔ وہ لڑکپن ہی سے دینو یا فضلو کمہار کی دکانوں کے اوپر چوباروں میں جمنے والی جوئے کی محفلوں میں شامل ہوتا اور رات کو خواب بھی فلاش ہی کے دیکھتا تھا اور میں نے کبھی تاش کو ہاتھ نہیں لگایا ۔ وہ رلدبلا نوش تھا اور میں نے، شراب تو دور رہی ، سگریٹ بھی پہلی بار ۱۹۳۲ء میں پیا جب میں بتیس برس کا تھا ۔ اس نے کٹڑہ گھونیاں ہو ، ہیرا منڈی ہو یا فارس روڈ ـــــ اُس بازار کی خوب سیر کی تھی اور میں نے اُدھر جھانک کر بھی نہیں دیکھا ۔ بات یہ ہے کہ ماں نے بچپن ہی سے ان تینوں کے خلاف سخت نفرت میرے دل میں بھر دی تھی ۔ والد محترم نے ان تینوں میدانوں میں جو کارہائے نمایاں سرانجام دئے ، میرا خیال ہے کہ ہمارے خاندان کی آئندہ دو نسلیں اس سلسلے میں کچھ بھی کیے بغیر اُن پر فخر سے سر بلند کر سکتی ہیں ۔ اُن کے انہیں کارناموں کی وجہ سے گھر کی جیسی حالت ہو گئی اور ہم نے جس عسرت میں بچپن کے دن کاٹے اُس نے خون کو کچھ ایسا منجمد کر دیا کہ آج ، جب میں سگریٹ یا شراب کو ویسا معیوب نہیں سمجھتا ، کبھی کھل کھیلنے کا حوصلہ نہیں ہوتا ۔ پتا جی جب ایک آدھ پیگ چڑھا لیتے تھے عموماً نعرہ لگاتے تھے : "کوڑی نہ رکھ کفن کے لیے !" وہ حال میں جیتے تھے اور اُنھوں نے کبھی مستقبل کی فکر نہیں کی ۔

ردِ عمل کے طور پر میں نے لڑکپن ہی میں زندگی کا سارا خاکہ تیار کر لیا تھا ـــــ اور منٹو کو میرے اس زہد ، حسابیت ، پلاننگ ، کفایت شعاری اور ٹھہراؤ سے نفرت تھی ۔ اپنی اس نفرت کا اظہار اُس نے کئی بار سخت ترین الفاظ میں کیا ۔"

...... مجھے منٹو نے فلمستان میں کام کرنے کے لیے بمبئی بلایا تھا ۔ میرے بمبئی پہنچنے کے دوسرے یا تیسرے دن کا ذکر ہے ، ہم وکٹوریہ میں آمنے سامنے بیٹھے گرانٹ روڈ کو جا رہے تھے ۔ منٹو نے تھوڑی سی پی رکھی تھی ۔ اچانک اُس نے انگریزی میں کہا :

"I Like you, though I Hate you."

.... ڈیڑھ سال بعد ہم فلمستان کی کنٹین میں بیٹھے تھے ۔ لنچ کا وقت تھا ۔ منٹو کی میز پر حسبِ دستور راجہ مہدی علی خاں ، واچا وغیرہ دو ایک دوست تھے ۔ میں برابر کی میز پر اپنی یونٹ کے چند دوستوں کے ساتھ بیٹھا تھا ۔ نہ جانے کیسے ہندوؤں کے واہ کرم سنسکار اور کپال کریا ـــــ یعنی مردے کی کھوپڑی کو توڑنے کی رسم ـــــ کا ذکر چلا تو منٹو نے دانت پیس کر کہا :

"اشک جب مرے گا تو اُس کی کپال کریا میں کروں گا ۔"

........میں کے ۔ ای ۔ ایم ۔ ہسپتال میں بیمار پڑا تھا ۔ ڈاکٹروں نے دق کا فتویٰ دے دیا تھا ۔ راجہ مہدی علی خاں مجھ سے ملنے آیا اور اُس نے کہا :

"منٹو کہتا ہے کہ سالا اس طرح پیسہ نہ جوڑتا تو بیمار نہ پڑتا ۔"

جب گرانٹ روڈ کو جاتے ہوئے منٹو نے مجھ سے کہا تھا : میں تمھیں پسند کرتا ہوں لیکن مجھے تم سے سخت نفرت ہے تو میں نے جواب میں کہا کہ یہی حال میرا ہے ۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں نے محض جواب کے لیے جواب دے دیا تھا ورنہ منٹو سے مجھے در اصل کبھی نفرت نہیں ہوئی ۔ رہا منٹو ، تو اس نفرت کے باوجود ، جس کا اظہار وہ وقتاً فوقتاً کرتا تھا ، اور اس تضاد کے باوجود جو ہماری طبیعتوں میں تھا ، میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ ہم دونوں گہرے دوست ہوتے اگر میں نے اپنے پھکڑپنے میں

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

منٹو کو بنا دیکھے، بنا جانے، بنا پڑھے اُس کے خلاف ایک سخت جملہ نہ کس دیا ہوتا۔

بات شاید ۱۹۳۸ء یا ۱۹۳۹ء کے آس پاس کی ہے۔ منٹو کی ایک کہانی "خوشیا" ایک رسالے میں چھپی تھی۔ میں اور راجندر سنگھ بیدی اُس زمانے میں ساتھ ساتھ لکھا پڑھا کرتے تھے۔ وہ کہانی لکھتے تو مجھے سنانا نہ بھولتے اور میں لکھتا تو اُنہیں جا سناتا۔ دونوں مل کر ہمعصروں کے افسانوں پر تبادلۂ خیالات کرتے۔ اور جیسا کہ جوانی میں ہوتا ہے، ہماری آراء خاصی تیز اور حکمی ہوتیں۔ بیدی نے "خوشیا" کے بارے میں میری رائے پوچھی۔

میں نے اُس وقت تک منٹو کی کوئی چیز نہ پڑھی تھی، نہ اُسے دیکھا تھا۔ "سرگذشتِ اسیر" کے نام سے ہیوگو کا ایک ترجمہ منٹو کے نام سے شائع ہوا تھا اور میں نے کسی سے سنا تھا کہ وہ روسی افسانوں کے ترجمے بغل میں دبائے کسی ناشر کی تلاش میں لاہور آیا تھا۔ اس بات میں کہاں تک صداقت ہے، یہ میں نہیں جانتا۔ بہرحال "خوشیا" کی اشاعت سے پہلے منٹو کے بارے میں یہی دو ایک باتیں میں جانتا تھا۔ اور چونکہ لکھنا میں نے کرشن، منٹو اور بیدی سے بہت پہلے شروع کر دیا تھا، عمر میں بھی تینوں سے بڑا ہوں اور اُس وقت تک میرے کچھ مشہور افسانے، "ڈاچی"، "کونپل"، "قفس" وغیرہ لکھے جا چکے تھے اور مترجم کو میں طبع زاد لکھنے والے سے کمتر سمجھتا تھا، اس لیے میری نظروں میں منٹو کی کوئی خاص وقعت نہ تھی۔ ظاہر ہے کہ "خوشیا" پڑھتے وقت بھی میں پہلے سے مصنف کے خلاف بدظن تھا۔ "خوشیا" مجھے بہت اچھا بھی نہیں لگا، حالانکہ منٹو کی کہانیوں میں اسے خاصا درجہ حاصل ہے اور بنیادی خیال کو منٹو نے بہت اچھی طرح نبھایا ہے، تو بھی مجھے یہ اعتراض تھا کہ "خوشیا" حقیقی کردار نہیں، بلکہ مصنف کے دماغ کی اختراع ہے۔ میرے ایک دوست اُس زمانے میں باقاعدہ اُس گلی کی سیر کرتے تھے اور ان کی وساطت سے مجھے اُس کے آداب و قواعد سے خاصی واقفیت تھی۔ نچلے طبقے کی طوائفوں کے (جیسی کہ خوشیا کی کانتا ہے) دلال ان سے پہلے ہی جسمانی طور پر متعارف ہو جاتے ہیں، یہ بات میں

یقینی طور پر جانتا تھا، اسی لیے میرا خیال تھا کہ خوشیا کا کردار غیر حقیقی ہے۔ بیدی نے جب خوشیا کے بارے میں میری رائے پوچھی تو اُس وقت غیر شعوری طور پر یہ باتیں میرے دماغ میں تھیں۔ یوں بھی بھکڑپنے کے دن تھے، کسی چیز پر اتنی سنجیدگی سے غور کرنے کی عادت نہ تھی، جو منہ میں آیا بک دیتے تھے، اس لیے میں نے کہا:

"دو کوڑی کی کہانی ہے۔"

میں نے یہ بات کہی اور بھول گیا، لیکن بیدی نہیں بھولا ــــ جب کچھ عرصے کے بعد وہ دہلی گیا اور وہاں منٹو نے (جو آل انڈیا ریڈیو دہلی میں آ گیا تھا) اپنی عادت کے مطابق اُسے پریشان کیا تو نہ جانے کیسے اور نہ جانے کس سلسلے میں بیدی نے 'خوشیا' کے بارے میں میری رائے کا ذکر کر دیا۔

دلی سے واپس آ کر بیدی نے منٹو سے اپنی ملاقات کا حال سنایا اور کہا کہ میں نے منٹو تک تمھاری بات پہنچا دی ہے۔ چونکہ مجھے کبھی یہ خیال بھی نہ تھا کہ منٹو اور میں کبھی ایک دوسرے کا راستہ کاٹیں گے اس لیے میں نے اس اطلاع کو سنا اَن سنا کر دیا۔ لیکن ۱۹۴۰ء میں جب کرشن چندر کے بلاوے پر میں دلی ریڈیو سٹیشن گیا اور وہاں جاتے ہی ملازم ہو گیا تو مجھے پہلی بار اس بات کا احساس ہوا کہ میرا وہ ریمارک کہاں تک پہنچ گیا ہے۔ دوستوں نے میری ملازمت پر اس لیے خوشی کا اظہار کیا کہ اب منٹو کو اپنا بدل ملے گا۔ اگرچہ میں اور منٹو کبھی آمنے سامنے نہ ہوئے تھے لیکن لوگوں نے ہم کو ایک دوسرے کا حریف مان لیا تھا!

دہلی میں اپنی نوکری پر آنے کے دوسرے ہی دن مجھے اس بات کا پتا چل گیا، اور چونکہ میں ایک بڑی تکلیف دہ اور کش مکش بھری زندگی سے نجات پا کر آیا تھا اس لیے اس خیال سے میری روح کانپ گئی کہ مجھے پھر کسی سے مقابلہ کرنا پڑے گا۔ میں نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ میں موقع ملتے ہی منٹو کو سمجھاؤں گا کہ لوگ محض تماشا دیکھنا چاہتے ہیں اس لیے ہم کیوں تماشا بنیں؟ لیکن ایک تو یہ کہ ریڈیو میں اُس وقت منٹو کا طوطی بولتا تھا اور دوسرے وہ پہلے ہی سے مجھے نیچا دکھانے

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

کے لیے اُدھار کھائے بیٹھا تھا اس لیے میری کوششیں بار آور نہیں ہوئیں ۔ ریڈیو کا دفتر اُن دنوں علی پور روڈ کی ایک بڑی کوٹھی میں تھا ۔ بڑے کمرے سٹیشن ڈائریکٹر ، پروگرام ڈائریکٹر اور میوزک ڈیپارٹمنٹ کے پاس تھے ۔ چھوٹے کمروں میں سے (جو شاید کوٹھی کے باتھ روم رہے ہوں گے ۔) ایک میں راشد ، دوسرے میں کرشن اور تیسرے میں منٹو بیٹھتے تھے ۔ یہ کمرے ساتھ ساتھ تھے ۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں کرشن کے کمرے میں بیٹھا تھا ۔ کرشن سٹوڈیو میں (جو سڑک کے دوسری طرف ایک کوٹھی میں واقع تھا) گیا ہوا تھا اور میں کوئی فیچر لکھ رہا تھا کہ منٹو ٹہلتا ہوا آیا اور ادھر اُدھر کی بات کر کے اُس نے 'خوشیا' کی بات چھیڑی ۔

"مجھے معلوم ہوا ہے کہ تمھیں میری کہانی 'خوشیا' پسند نہیں آئی ۔" وہ بولا ۔

میں نے ٹالنے کی کوشش کی لیکن منٹو یوں چھوڑنے والا نہیں تھا ۔

"تمھیں اُس میں کیا پسند نہیں آیا ؟" اُس نے پوچھا ۔

میں نے اُسے سمجھایا کہ میں یہاں ہندی صلاح کار کی حیثیت سے آیا ہوں ، میرا تمھارا کوئی مقابلہ نہیں ۔ تم مزے سے کام کرو اور مجھے کام کرنے دو ۔ فضول کے بحث مباحثے میں مت پڑو ۔ لوگ تماشا دیکھنا چاہتے ہیں ، ہم کیوں تماشا بنیں ؟

لیکن منٹو نے مجھے بات نہیں ختم کرنے دی ۔ اُس نے ہاتھ کی جنبش سے ، جیسے میری بات کو کاٹتے ہوئے ، وہی سوال دہرایا اور شاید کوئی سخت بات بھی کہی ۔ مجبوراً میں نے کہا :

"کہانی وہ اچھی ہے لیکن حقیقی نہیں ۔"

"کیوں حقیقی نہیں ؟"

تب میں نے اپنا اعتراض بتایا :

"تمھیں ایک خیال سوجھا اور تم نے اپنے آپ کو دلال کے روپ میں رکھ کر ویسی صورت میں اپنے ردِ عمل کو قلمبند کر دیا ۔ حقیقی دنیا میں خوشیا واقعی دلال ہوتا ، کانتا اُس کے سامنے یوں برہنہ ہو جاتی تو وہ

اسے وہیں دبوچ لیتا ۔۔۔ تم نے جو کچھ لکھا وہ ایک پڑھا لکھا شاعر سوچ سکتا ہے ، اَن پڑھ دلال نہیں ۔"

کچھ اسی طرح کی بات بڑے زوروں سے میں نے کہی ۔ منٹو لمحہ بھر چپ رہا پھر تلملا کر بولا :

"ہاں ہاں ، میں وہ دلال ہوں ، منٹو وہ دلال ہے ۔ تمھیں افسانہ نویسی کا علم بھی ہے ! تم خود کیا لکھتے ہو ؟"

لیکن اُسی وقت کرشن چندر آ گیا یا مجھے الوانی (سٹیشن ڈائریکٹر) نے بلا لیا یا جانے کیا ہوا ، بہرحال وہ قصہ وہیں ختم ہو گیا ۔

.... لیکن وہ قصہ کبھی ختم نہیں ہوا ۔ دل میں جو چپقلش رہی سو رہی ، منٹو میرے اس اعتراض کو کبھی نہیں بھول سکا ۔ گذشتہ سال 'نقوش' کے کسی خاص نمبر میں اُردو ادیبوں کا ایک سمپوزیم شائع ہوا تھا ۔ اس وقت ، جب اُردو میں کوئی نیا افسانہ لکھے ہوئے (ادھر میرے جو افسانے اُردو میں چھپے بھی ہیں وہ ایک طرح سے ہندی سے ترجمہ ہوئے ہیں ۔) مجھے آٹھ برس ہونے کو آئے ہیں اور میرے احباب اور اُردو کے ناظر تک مجھے بھول گئے ہیں ، منٹو کو میں یاد رہا ۔ 'خوشیا' کے بارے میں میرے اعتراض اور اپنے جواب کا ذکر کرنا وہ اس سمپوزیم میں بھی نہیں بھولا !

اس کے بعد اگرچہ میں نے بڑی کوشش کی کہ منٹو سے میری چشمک نہ ہو ، میں اپنی میز بھی اُٹھا کر دوسری منزل میں لے گیا لیکن میری تمام کوششیں ناکام رہیں ۔ میں جب بھی نیچے اُترتا ، دوستوں میں جاتا ، منٹو سخت حقارت کی نظر سے مجھے دیکھتا اور کسی نہ کسی طریقے سے اپنی نفرت کا اظہار بھی کر دیتا ۔

اُن دنوں کی بڑی صاف تصویر دماغ کے پردے پر نقش ہے ۔ منٹو ریڈیو کے لیے ڈرامے لکھنے پر مامور تھا ۔ کرشن چندر ڈرامے کا انچارج تھا ۔ میں ہندی صلاح کار تھا ، اور چونکہ اس نظام میں ہندی کو اہم زبان نہ سمجھا جاتا تھا اس لیے کچھ زیادہ کام نہ تھا اور میں فرصت کے وقت میں ایک آدھ ڈراما بھی لکھ دیا کرتا تھا ۔

منٹو کا ڈھنگ یہ تھا کہ وہ اُردو کا ٹائپ رائٹر لے کر بیٹھ جاتا اور

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

کرشن سے پوچھتا: "بولو بھئی، کس موضوع پر ڈراما لکھا جائے؟" موضوع سنتے ہی فوراً ٹائپ کرنا شروع کر دیتا اور شام تک مسودہ کرشن کو دے دیتا۔ منٹو کو اس بات کا زعم تھا، اور اس کا اعلان وہ عموماً کیا کرتا تھا، کہ وہ جس چیز پر چاہے ڈراما لکھ سکتا ہے۔ ریڈیو کے ڈراما آرٹسٹ غلام محمد، رندھیر (جو اب فلم ایکٹر ہیں)، تاج محمد وغیرہ اُسے عموماً گھیرے رہتے تھے۔ منٹو لکھتے لکھتے انہیں ڈراما سناتا بھی کرتا تھا اور وہ سن کر "منٹو صاحب، آپ ڈرامے کے بادشاہ ہیں" کہتے ہوئے منٹو کے خرچ پر چائے اُڑایا کرتے تھے۔ جاوید اور حسرت صاحب سے منٹو کا پینے پلانے کا رشتہ تھا اور اڈوانی اُس سے اس لیے دبتے تھے کہ منٹو کے کوئی رشتے دار محکمہ اطلاعات اور براڈکاسٹنگ کے سکریٹری تھے۔ ریڈیو سٹیشن پر ہر وقت 'منٹو صاحب'، 'منٹو صاحب' ہوتی رہتی اور ہر معاملے میں منٹو کی رائے حکم کا درجہ رکھتی تھی۔ منٹو خوشامدیوں یا دوستوں میں گھرا رہتا۔ لنچ کے وقت کبھی اُس کے اور کبھی کرشن کے کمرے میں محفل جمتی۔ میں بھی کبھی کبھی آ کھڑا ہوتا۔ منٹو کبھی مجھے بات نہ کرنے دیتا۔ میرے بارے میں کوئی نہ کوئی تحقیر آمیز ریمارک ضرور پاس کرتا اور اگرچہ میرے معاملے میں لوگ اُس کا ساتھ نہ دیتے مگر مجھے بڑی کوفت ہوتی۔

آخر ایک دن میں نے کرشن سے کہا:

"دیکھو بھائی، تم منٹو کو سمجھا دو، وہ مجھے خواہ مخواہ تنگ کرتا ہے، میں طرح دے جاتا ہوں۔"

"تم بھی اُسے تنگ کرو۔" کرشن نے کہا، "میرے سمجھانے سے وہ کیا سمجھے گا!"

اور اُس دن میں دفتر گیا تو میں نے طے کر لیا کہ آج میں منٹو کو پریشان کروں گا۔ کچھ دن پہلے اُس کی کہانی "دھواں" شائع ہوئی تھی۔ کہانی مجھے بے حد پسند تھی۔ منٹو نے ایک نازک موضوع پر بڑی نزاکت اور نفاست سے افسانہ لکھا تھا۔ لیکن میں تو شرارت پر تلا ہوا تھا اور چونکہ میں اس دوران میں منٹو کی انانیت کے ہر پہلو کا مطالعہ کر چکا تھا اس لیے میں نے اپنا طرزِ عمل طے کر لیا تھا۔ دفتر پہنچ کر میں منٹو کے کمرے میں گیا۔ وہ ابھی آ کر بیٹھا ہی تھا کہ میں نے کہا:

"میں نے تمھاری کہانی 'دھواں' پڑھی۔"

"کیسی لگی؟"

"اچھی ہے، اب تم 'چینی' پر لکھو۔"

منٹو لمحہ بھر چپ رہا۔ پھر اُس نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں تقریباً باہر نکالتے ہوئے کہا:

"کیا مطلب ہے تمھارا؟"

میں نے کچھ نہیں کہا اور وہی بات دہرا دی: "بس اب تم چینی پر لکھو۔"

اُس وقت عصمت نے "لحاف" نہ لکھا تھا۔ منٹو چڑ گیا۔ وہ کہنا چاہتا تھا کہ تم خود کیا افسانے لکھتے ہو، لیکن کچھ دن پہلے وہ اس بات کا اعلان کر چکا تھا کہ اُس نے کبھی میرا افسانہ نہیں پڑھا اس لیے اُس نے کہا:

"تم کیا جھک مارتے ہو؟ میں نے تمھارے ڈرامے پڑھے ہیں۔"

اُس وقت میرا مجموعہ "پاپی" چھپ چکا تھا اور میں کچھ بہت اچھے ڈرامے لکھ چکا تھا۔ چونکہ لڑنے کا فن مجھے خوب آتا ہے اس لئے طرح دے کر میں نے کہا:

"میں تو ڈراما لکھنا ابھی سیکھ رہا ہوں۔ اس لیے میرے ڈراموں کی بات چھوڑو، لیکن تم جو ڈراموں کے بادشاہ کہلاتے ہو جیسی جھک مارتے ہو وہ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ "کروٹ" میں تم نے "ماہم" کے افسانے "رین" کی کہانی چرا لی ہے۔ "روح کا ناٹک" پورے کا پورا ترجمہ کر دیا ہے (اُس وقت میں نے مصنف کا نام بھی لیا تھا۔) اور حوالہ تک نہیں دیا۔ میں اچھے ناٹک نہیں لکھتا لیکن طبع زاد تو لکھتا ہوں۔ میری اچھی بری چیز میری اپنی ہے کسی دوسرے کی چرائی ہوئی تو نہیں۔"

منٹو جھلّا اُٹھا لیکن میں وہاں نہیں رکا، کرشن چندر کے کمرے میں آ گیا۔ منٹو ڈراما لکھنے جا رہا تھا لیکن ڈراما لکھنا تو دور رہا اُس کے لیے اپنے کمرے میں بیٹھنا تک مشکل ہو گیا۔ وہ میرے پیچھے پیچھے کرشن کے کمرے میں آیا۔ اُس نے پھر مجھ سے افسانے کے

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

فن کو لے کر بات کرنے کی کوشش کی لیکن میں پھر طرح دے کر نکل گیا اور سٹوڈیو چلا گیا ۔ منٹو نے سٹوڈیو میں میرا پیچھا کیا لیکن میں پھر ٹال گیا ۔

اُسی شام وشوامتر عادل اپنے دوست اور بہنوئی مسٹر مدن موہن بھلہ کے ساتھ منٹو سے ملنے گیا ۔ اُس نے آ کر بتایا کہ منٹو نے اُنھیں اپنے افسانوں کا مجموعہ دیا اور مجھے بے شمار گالیاں دیں کہ اشک سالا اپنے آپ کو سمجھتا کیا ہے ۔ اُس کو افسانے کے فن کی ابجد کا بھی علم نہیں ۔ "ادبِ لطیف" میں اُس نے افسانے کے فن پر جو مضمون لکھا تھا وہ کیا بکواس ہے ، وغیرہ وغیرہ ۔

تین دن تک منٹو مجھے گالیاں دیتا رہا ۔ میں اُوپر کمرے میں بیٹھا وہ سب سنتا رہا کیونکہ تماشائی بڑے خوش تھے اور منٹو کیا کہتا ہے ، وہ مجھے رائی رتی بتانا نہ بھولتے تھے ۔ لیکن میں چپ رہا اور دل ہی دل میں ہنستا بھی رہا کہ جیسا میں نے سوچا تھا ویسا ہی ہوا اور افسوس کرتا رہا کہ بادلِ ناخواستہ مجھے وہ سب کرنا پڑ رہا ہے جس کی دوستوں کو توقع تھی ۔

میں منٹو کے افسانے پسند کرتا تھا ۔ 'خوشیا' کے بعد میں نے منٹو کے کئی بہت اچھے افسانے پڑھے تھے ۔ 'نیا قانون' ، 'منتر' ، 'شو شو' ، 'ڈرپوک' ، 'موسم کی شرارت' ، 'ہتک' ، 'مسز ڈی کوسٹا' مجھے بہت پسند آئے تھے ۔ لیکن جب تک میں دل میں رہا میں نے کبھی منٹو کے سامنے اُس کے افسانوں کی تعریف نہیں کی ۔ چونکہ منٹو کی نظر کافی تیز تھی اس لیے خوشامد کرنے پر وہ اگرچہ وقتی طور پر خوش ہوتا تھا لیکن خوشامدی کے لیے اُس کے دل میں کوئی عزت نہیں رہتی تھی ۔ یہ عجیب بات ہے کہ کرشن نے مجھے دلی بلا کر منٹو کے مقابل لا کھڑا کیا لیکن جب بھی ہم میں جھگڑا ہوا اُس نے ہمیشہ منٹو کی طرفداری کی ۔ منٹو اس طرفداری کا فائدہ اُٹھا لیتا تھا لیکن کرشن کے لیے اُس کے دل میں کوئی عزت نہ تھی ۔ وہ اُسے بھی گالیاں دیتا تھا ۔ چونکہ اُن دنوں منٹو کو ہر وقت خوشامدی لوگ گھیرے رہتے تھے اس لیے میری اس حقیقی تعریف کو بھی منٹو خوشامد پر محمول کرے ، یہ میری انا کو منظور نہ تھا ۔ میں دانستہ منٹو کے اچھے افسانوں کا ذکر چھوڑ

جاتا اور اُس کے کمزور افسانوں کی تنقید بڑے زوروں سے کرتا ۔ غرضیکہ خاصی چپقلش رہتی تھی ۔

اُن دنوں عریاں نگاری کو ترقی پسندی سمجھا جاتا تھا ۔ احمد علی ، عصمت اور منٹو اس کے علمبردار تھے ۔ کرشن کھل کر نہ کھیلتے تھے لیکن انھوں نے بھی اپنی کہانیوں کا ایک فارمولا بنا رکھا تھا جس میں وہ رومان انگیزی اور ترقی پسندانہ طنز میں تھوڑی سی عریانی بھی ملا دیتے تھے ۔ میرا کہنا تھا کہ عورتوں کی عصمت فروشی اور آبرو ریزی کے علاوہ بھی بیسیوں مسائل ہیں جو اتنے ہی اہم ہیں لیکن نہ جانے کیوں اُس وقت ترقی پسندوں کو عریاں نگاری اور گھٹیا درجے کی طوائفوں کے چوباروں میں تعلیم یافتہ نوجوانوں کا مارے مارے پھرنا ہی واحد موضوع سوجھتا تھا ۔ جب میں کرشن سے کہتا کہ یہ ترقی پسندی نہیں تو کرشن کہتا کہ چونکہ تم یہ سب لکھ نہیں سکتے اس لیے تمھیں منٹو اور عصمت (ان دونوں کے ساتھ وہ اپنے کو بھی شامل کر لیتا ۔) سے حسد ہوتا ہے ۔ ایک دن منٹو نے بھی کچھ ایسی ہی اڑ ہانکی ، تو میں نے طے کیا کہ میں بھی ایک ایسا ہی افسانہ لکھوں گا ۔ یہ یاد نہیں کہ کسی نے موضوع تجویز کیا یا میں نے اپنے آپ لکھا ، لیکن ہم دونوں نے ایک ہی موضوع — یعنی 'نوکروں کے سامنے مالکوں کی جنسی بے پروائی' — پر افسانے لکھے ۔ منٹو نے "بلاؤز" اور میں نے "اُبال" ۔ دونوں افسانے "ساقی" دہلی کے ایک ہی نمبر میں (غالباً کسی سالنامے میں) چھپے ۔ 'اُبال' کو دوستوں نے بہت پسند کیا ۔ کرشن نے اُسے اُس وقت تک کے میرے افسانوں میں بہترین مانا ۔ بعد میں اس کا انگریزی ترجمہ شایع ہوا تو وہ بھی کافی پسند کیا گیا ۔ 'بلاؤز' اور 'اُبال' اُس وقت کے میرے اور منٹو کے آرٹ کی نمائندگی کرتے ہیں ۔ عریانی دونوں افسانوں میں ایک جیسی ہے ۔ مالکوں کی جنسی بے پروائی کا ذکر دونوں افسانوں کے نوکروں پر ایک جیسا ہوتا ہے لیکن جہاں 'بلاؤز' کے انجام کی حقیقت کوری حقیقت ہے وہاں 'اُبال' کے انجام میں نوکر کی ٹریجڈی کے ساتھ سماجی ٹریجڈی بھی پنہاں ہے اور افسانہ سماجی حقیقت (Social Realism) کا نمونہ پیش کرتا ہے ۔ افسانہ نگار کو حقیقت ، جیسی بھی ہے ، اُس کا خاکہ کھینچنے تک ہی اپنے قلم کو محدود رکھنا چاہیے یا اس حقیقت کے پس منظر میں سماج کا بھی

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

جائزہ لینا چاہیے؟ یہ بحث طویل ہے اور 'فن برائے فن' اور 'فن برائے زندگی' کے پیرو اس موضوع پر ہمیشہ بحث کرتے رہیں گے۔ بہرحال منٹو کے ساتھ ہونے والی چشمک میں "میں نے بھی ویسا ہی ایک افسانہ لکھا اور اگرچہ اُس کی بڑی تعریف ہوئی لیکن پھر میں نے اس طرف کا رخ نہیں کیا۔ اس لیے نہیں کہ ویسے افسانے لکھنا میں کچھ معیوب سمجھتا ہوں بلکہ اس لیے کہ وہ میرے مزاج اور طبیعت سے میل نہیں کھاتے۔

باری صاحب کے بارے میں منٹو نے لکھا ہے کہ وہ بڑے رنچھوڑ قسم کے آدمی تھے۔ لیکن منٹو کو، جیسا کہ میں نے دیکھا، میرا خیال ہے کہ باری صاحب کا کچھ اثر اس پر بھی تھا ــ یہ اور بات ہے کہ وہ اپنے کردار کے اس پہلو سے خود واقف نہ ہو۔ جن حالات میں اچانک ایک دن منٹو دہلی سے غائب ہو گیا تقریباً اُنھی حالات میں وہ بمبئی سے پاکستان بھاگ گیا۔ دہلی سے اُس کے فرار کا باعث میں تھا اور بمبئی سے نذیر اجمیری۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ منٹو خود بھی اُس فرار کا باعث تھا۔ کیونکہ لڑائی میں جب تک وہ مارتا چلا جاتا تھا خوش رہتا تھا اور جب دوسرے اُسی کے حربوں کو اُس پر آزماتے تھے تو وہ میدان چھوڑ کر بھاگ جاتا تھا۔ بمبئی سے بھاگنے کے بارے میں نذیر اجمیری کی مخالفت کا ذکر کرتے ہوئے منٹو نے لکھا ہے:

> "میں نے بہت غور کیا، کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ آخر میں نے اپنے آپ سے کہا: 'منٹو بھائی ـــ آگل راستہ نہیں ملے گا ـــ کار موٹر روک لو ـــ اُدھر باجو کی گلی سے چلے جاؤ۔' اور میں باجو کی گلی سے پاکستان چلا آیا۔"

دہلی سے اچانک منٹو غائب ہو گیا تو میں حیران رہ گیا تھا۔ حالانکہ یہ افواہ آڑی تھی کہ اسے فلم میں نوکری مل گئی ہے۔ لیکن دو سال بعد اُس نے خود مجھے بتایا کہ وہ کسی نوکری کے بغیر دہلی سے چلا آیا تھا ـــ باجو کی گلی سے ـــ آگل راستہ نہ ملنے پر ـــ بالکل ویسے ہی جیسے کچھ سال بعد وہ بمبئی چھوڑ گیا۔

میرے والد زندگی بھر لڑتے رہے۔ 'کوڑی نہ رکھ کفن کے لیے!' کے ساتھ ساتھ جو دوسرا نعرہ وہ لگایا کرتے تھے وہ تھا ـــ 'سر قائم، کھنگ

دائم' ـــ اور وہ اپنے لڑکوں کو بھی یہی نیک صلاح دیا کرتے تھے۔ چونکہ اُن کا خیال تھا کہ اُن کا کوئی بیٹا شہر کا سب سے بڑا لڑاکا ہوگا اس لیے وہ سب کو لڑنے کے طریقے بتایا کرتے تھے۔ سب سے زیادہ زور وہ اس بات پر دیا کرتے تھے کہ جو آدمی پٹ سکتا ہے وہی پیٹ بھی سکتا ہے۔ پٹنے سے بچنا مشکل ہے۔ پٹو، لیکن پیٹنے والے کو نہ چھوڑو ـــ میری صحت تو لڑکپن ہی سے خراب تھی۔ اپنے والد یا بھائیوں کی طرح تو میں کیا لڑتا لیکن یہ بات ضرور ذہن نشین ہو گئی، اور کشمکشِ حیات میں جہاں جہاں بھی معرکہ پڑا ہے میں نے پٹ کر آخر پیٹنے والے کو پیٹ دیا ہے!

منٹو سے میرا دو بار سابقہ پڑا۔ ایک بار دہلی میں اور دوسری بار بمبئی میں۔ دہلی میں "میں نے اُسے زک دے دی، لیکن بمبئی میں تمہاری جوڑ برابر رہی۔

'دھواں' کے سلسلے میں ہم میں جو چشمک ہوئی اُس کے بعد میرے اور اُس کے تعلقات اور بھی کشیدہ ہو گئے۔ چونکہ منٹو زور میں تھا اور کرشن اگرچہ مجھے کچھ نہ کہتا تھا لیکن ہر بار منٹو کے لیے ڈھال بن جاتا تھا اس لیے میرا وار اوچھا پڑتا تھا لیکن) اس دوران میں اپنے زعم میں منٹو، راشد سے بھی بگاڑ بیٹھا۔ راشد آزاد نظم کے بانی سمجھے جاتے تھے اور منٹو کو آزاد نظم سے چڑ تھی۔ اُنھیں دنوں راشد کی نظموں کا مجموعہ "ماوراء" کے نام سے شائع ہوا جس پر کرشن چندر نے دیباچہ لکھا۔ منٹو نے دونوں کا مذاق اُڑایا۔ اُس نے "نیلی رگیں" کے عنوان سے ایک ڈراما بھی لکھا جس میں راشد کی نظموں سے الفاظ لے کر اُن کا مذاق اُڑایا گیا۔ ڈراما آزاد نظم سے شروع ہوتا ہے۔ دو مکالمے دیکھیے:

سعید (شاعر): کرشن، تم نے کبھی کسی عورت کے ٹھنڈے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں دبائے ہیں؟

کرشن: ٹھنڈے ہاتھ ... ؟

سعید: ٹھہرو، مجھے اپنا فقرہ درست کر لینے دو ـــ اب بتاؤ کیا تم نے کسی اجنبی عورت کے ٹھنڈے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں دبائے ہیں ـــ ایسے ہاتھ جو چاند کی طرح خنک ہوں ـــ

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

کسی اجنبی عورت کے ہاتھ جو تمھاری زندگی میں یوں داخل ہوں جیسے رات کے سنسان اندھیرے میں کوئی جگنو بھٹکتا آ نکلے ۔

کرشن (مذاق کے طور پر) : اپنی دم سے لالٹین باندھے — نہیں — چاند کی ڈلی چوستا ہوا ادھر آ نکلے ۔ تمھیں آج ہو کیا گیا ہے سعید ؟ یہ ٹھنڈی یخ عورت تمھاری زندگی میں کب داخل ہوئی ؟

کچھ دن منٹو آزاد شاعری کا ، راشد کی نادر تشبیہوں کا ، اجنبی عورت کا ، زمستان کی رات کا مذاق اُڑاتا رہا ، پھر اُس نے کوئی دوسرا موضوع ڈھونڈھ لیا اور بات آئی گئی ہو گئی ، لیکن راشد اسے نہیں بھولے ۔

اس کے بعد ایک دن منٹو نے کوئی ڈراما لکھا اور راشد کو پڑھنے کے لیے دیا ۔ راشد ٹائپ شدہ مسودہ اپنے کمرے میں لے گئے اور کچھ دیر بعد واپس آ کر انھوں نے مسودہ واپس کیا ۔

"کیسا ہے ؟" منٹو نے پوچھا ۔

"نہایت اچھا ٹائپ ہوا ہے ۔" راشد نے اُس استہزاء آمیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا جو اُن کی اپنی چیز تھی ۔

اور منٹو (بقولِ خود) کباب ہو گیا ۔ اس کے بعد منٹو ہفتوں راشد اور ان کی نظموں کو کوستا رہا ۔ اپنے کسی دوست سے اُس نے راشد کی نظموں پر ایک مضمون بھی لکھوایا ۔

ہندی صلاح کار کی حیثیت سے میں زیادہ وقت راشد کے ساتھ گزارتا تھا اور چونکہ منٹو اور راشد میں چلنے لگی تھی ، راشد میرے پڑوسی بھی تھے ، منٹو مجھے زیادہ نقصان نہ پہنچا سکتا تھا ۔ تاہم مجھے پشیمان کرنے میں منٹو نے کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی ۔

پھر غالباً ۱۹۴۲ء کے اواخر یا ۱۹۴۳ء کے شروع میں (ٹھیک سنہ مجھے یاد نہیں ۔) اچانک ایک دن راشد ترقی کر کے پروگرام ڈائریکٹر (پروگرام ایگزیکٹو) ہو گئے ۔ راشد نے چارج سنبھالتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ کرشن کی غیر حاضری میں اُس کا تبادلہ لکھنؤ کرا دیا ۔ بات دراصل یہ تھی کہ راشد کو چھوڑ کر دہلی کے ریڈیو سٹیشن پر پروگرام اسسٹنٹوں

میں کرشن سب سے قابل تھا اور باقی جتنے پروگرام اسسٹنٹ تھے وہ اپنا شیڈیول بنانے میں کرشن سے مدد لیتے تھے اور ظاہر ہے کہ اُس کا کہنا مانتے تھے ۔ پروگرام ڈائریکٹر تک بیسیوں باتوں میں کرشن سے مدد لیتے تھے اس لیے اس کے کام میں دخل نہ دیتے تھے اور بہت سی باتیں کرشن براہِ راست ڈائریکٹر سے منظور کرا لیتا تھا ۔ راشد کی فطرت میں آمریت کو کافی دخل تھا ۔ انھیں یہ منظور نہ تھا کہ کرشن ان کو نظر انداز کر جائے ۔ اس لیے انھوں نے اُس کو لکھنؤ بھجوا دیا ۔ لیکن کرشن کی تبدیلی جن حالات میں ہوئی (راشد نے اُن کی غیر حاضری میں اُن کے خلاف کچھ الزامات لگائے اور چونکہ بخاری صاحب تک راشد کی براہِ راست رسائی تھی اس لیے فوراً تبادلہ کرا دیا ۔) اس سے مجھے رنج ہوا اور میں نے راشد سے اپنے اس افسوس کا اظہار بھی کیا ۔ راشد اُمید کرتے تھے کہ میں اُن کی تائید کروں گا لیکن جب میں نے کرشن کی طرف داری کی تو ، باوجود اس کے کہ ہم برابر کے گھروں میں رہتے تھے اور میری بیوی اور بیگم راشد میں بہت اچھے تعلقات تھے ، روز کا ملنا بیٹھنا تھا ، راشد مجھ سے بدظن ہو گئے ۔

راشد پروگرام ڈائریکٹر ہو گئے اور کرشن چلے گئے تو منٹو نے کچھ ہی دنوں میں دوسرے پروگرام ڈائریکٹر (سریندر چوپڑہ) کو گانٹھ لیا ۔ اس کے جنم دن پر منٹو نے ایک بڑھیا سوٹ اُسے پرزنٹ کیا اور یوں اُسے اپنی طرف ملا لیا ۔ اڈوانی چونکہ مجھ سے خوش تھے اس لیے انھوں نے مجھے نئے پروگرام اسسٹنٹ کے آنے تک کرشن کی جگہ سنبھالنے کے لیے کہا ۔ منٹو کا ڈراما شیڈیول پر تھا ۔ میں نے پروڈیوس بھی کیا ۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ منٹو اُس کی ریہرسلوں میں سٹوڈیو بھی آتا رہا حالانکہ وہ شاذ ہی اپنے ڈراموں میں دل چسپی لیتا تھا ۔

اس دوران میں لکھنؤ سے ہندی کا ایک پروگرام اسسٹنٹ کرشن کی جگہ لینے کے لیے پہنچا — نہایت بدصورت ، لمبا تڑنگا ، چپٹی ناک والا نوجوان تھا ۔ اڈوانی نے صبح اُسے اور مجھے اپنے کمرے میں بلایا اور اُس سے کہا کہ وہ کچھ دن تک مجھ سے کام سیکھے ۔ کرشن کے کمرے میں ایک میز اور دو کرسیوں کے علاوہ زیادہ جگہ نہ تھی ۔ میں میٹنگ کے بعد کرشن والی کرسی پر جا بیٹھا اور اُس دن کا کام نمٹانے لگا ، لیکن

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

میٹنگ کے بعد ہی منٹو نے اُس لکھنوی پی۔ اے۔ (پروگرام اسسٹنٹ) کو سمجھایا کہ وہ پروگرام اسسٹنٹ ہے اور اُسے کرشن والی کرسی پر بیٹھنا چاہیے۔ وہ اپنے آپ کو سمجھتا بھی بہت کچھ تھا۔ کام سیکھنے کی بات بھی اُسے اچھی نہ لگی تھی۔ اُس نے راشد سے پوچھا تو راشد نے بھی اُس سے یہی کہا کہ ڈراما ڈیپارٹمنٹ کی سب ذمے داری تمھاری ہے۔ اشک تو آرٹسٹ ہے۔ کوئی بھی خرابی ہو، جواب دہ پروگرام اسسٹنٹ ہی ہوگا۔ مجھے ان سب باتوں کا علم نہ تھا۔ میں کرشن والی کرسی پر مزے سے کام کر رہا تھا کہ منٹو اُس لکھنوی پی۔ اے۔ کے ساتھ آیا۔ میرا دھیان مسودے میں لگا ہوا تھا کہ منٹو نے میری کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

"یہ آپ کی کرسی ہے۔"

ساتھ ہی اُس نے میری کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

"آپ ادھر آ جائیے۔"

میں نے نگاہیں اُٹھائیں۔ پی۔ اے۔ کی آنکھوں میں تحکم تھا اور منٹو کی آنکھوں میں فاتحانہ چمک۔ مجھے معاملہ سمجھنے میں دیر نہ لگی۔ میں نے کہا:

"میں اُوپر اپنے کمرے میں جاتا ہوں، آپ کو میری ضرورت ہو تو وہیں آ جائیے گا۔"

اور میں چلا گیا۔ میری آنکھوں کے آگے غصے کے مارے اندھیرا چھا گیا۔ راشد سے میں نے ذکر کیا تو معلوم ہوا کہ لکھنوی پی۔ اے۔ اُن سے مل چکا ہے۔ یہ بھی پتا چل گیا کہ وہ چاہتے ہیں اُن کے پروگرام اسسٹنٹ خود ہی غلطیاں کر کے سیکھیں۔ دراصل اُنھیں یہ بات پسند نہ آئی تھی کہ اڈوانی نے بغیر اُن سے پوچھے مجھے کرشن کی جگہ کام کرنے کو کہہ دیا۔ میں اس کا شائق بھی نہ تھا، کیونکہ ایک بار جب جگل صاحب نے مجھے پی۔ اے۔ کی جگہ آفر کی تھی تو میں نے انکار کر دیا تھا۔ لیکن اب، جب میں اس جگہ جا بیٹھا تو اس طرح اُٹھنا اور وہ بھی منٹو کے سامنے، اُس کی انگیخت پر، مجھے کھل گیا۔ پہلے خیال آیا کہ اڈوانی کے پاس جاؤں کیونکہ انھوں نے ہی مجھے بھیجا تھا، لیکن پھر سوچا کہ

اڈوانی کچھ نہ کر سکیں گے۔ منٹو کی آنکھوں کی فاتحانہ چمک میرے دل میں دور تک گھاؤ کرتی چلی گئی۔ اُسی غصے میں ایک لمحے کے لیے خیال آیا کہ استعفیٰ دے دوں، پھر خود ہی اس پر ہنسی آ گئی۔ جھلایا ہوا اُوپر اپنے کمرے میں جا بیٹھا۔ منٹو کی آنکھوں کی وہی چمک پھر سامنے آ گئی ــــ خدا گواہ ہے اگر منٹو اُس لکھنوی پی۔ اے۔ کے ساتھ نہ آیا ہوتا اور اُس کی آنکھوں میں وہ چمک نہ ہوتی تو میں وہ سب نہ کرتا جو میں نے کیا۔ اور منٹو کو دہلی نہ چھوڑنی پڑتی۔

اُس وقت کمرے میں جا کر بیٹھا تو کام کرنا میرے لیے یکسر مشکل ہو گیا۔ بار بار اپنی ہتک کا خیال آنے لگا۔ راشد پر غصہ آتا، اُس لکھنوی پی۔ اے۔ پر غصہ آتا، لیکن سب سے زیادہ غصہ آتا منٹو پر! اُس کی آنکھوں میں جو چمک تھی اُس سے پتا چل گیا تھا کہ میری ہتک کرنے والا نہ وہ پی۔ اے۔ ہے نہ راشد ہے، منٹو ہے، اور میں نے طے کر لیا کہ منٹو کو اس سازش کا مزا چکھاؤں گا۔ میرے غصے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ جتنے دن میں نے کرشن کی جگہ کام کیا اُس میں منٹو کا ڈراما پروڈیوس کیا اور حتی الامکان کوشش کی کہ میں اُس میں ایک لفظ نہ کاٹوں اور وہ اچھے سے اچھا پروڈیوس ہو۔ کچھ پہلے کا غصہ اور کچھ تازہ ہتک کا گھاؤ، کام وام چھوڑ کر میں بس کہنیاں میز پر ٹکا، ہتھیلیوں پر ٹھوڑی رکھ کر بیٹھ گیا۔

جانے اجداد میں سے کسی نے مہرشی چانکیہ کے آشرم میں تعلیم پائی تھی یا جانے ہمارا خاندان اُس سے وابستہ تھا یا بچپن سے والدِ محترم سے اُس مہرشی کے کارنامے سن سن کر میں نے اُسی طرح سوچنا سیکھ لیا تھا۔ بہرحال، ہمیشہ جب مجھ پر مصیبت آئی میری سمجھ اور سوچ کی قوتیں اور بھی تیزی سے کام کرنے لگیں اور توہین کرنے والے کو، اگر وہ میرے برابر کا ہے یا مجھ سے اونچا ہے، میں نے کبھی معاف نہیں کیا۔ اور یہ بات کتنی ہی بری کیوں نہ ہو، اُس سے ضرور انتقام لیا اور نہ صرف مصیبت سے نکلا ہوں بلکہ ایک قدم آگے ہی بڑھا ہوں۔

سوچنے پر مجھے معلوم ہوا کہ یہ لکھنوی پروگرام اسسٹنٹ نہایت احمق آدمی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ منٹو نے اُسے بھڑکایا، لیکن جو منٹو کے کہنے میں آ گیا اُس کی حماقت میں کیا شک ہے؟ اُس وقت بھی پنڈی میں میرا

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

کافی نام تھا ۔ اُس نے میرا نام نہ سنا ہو ، ایسی بات نہیں ۔ وہ سمجھ دار ہوتا تو مجھے الگ لے جا کر بات کر لیتا اور یوں تحکمانہ لہجے میں مجھ سے کچھ نہ کہتا ۔ سوچا کہ اس احمق ہی کو آلہ کار بنایا جائے ، اور کچھ دیر بعد میں نیچے گیا ۔ لکھنوی پی ۔ اے ۔ سینہ تانے ، چھوٹی ناک چڑھائے ، نتھنے پھلائے ، لکھنؤ کے اپنے قصے سنا رہا تھا کہ کیسے چپ صاحب (جو اس وقت لکھنؤ کے سٹیشن ڈائریکٹر تھے) اُسے چاہتے ہیں اور کیسے کیسے اُس نے وہاں کارہائے نمایاں سرانجام دے ہیں اور منٹو (اپنی عادت کے خلاف) چپ چاپ ، پاؤں کرسی پر رکھے ، گھٹنے باہوں میں دبائے ، ہمہ تن گوش اُس کی لن ترانیاں سن رہا تھا ۔ میں جا کر کھڑا ہوگیا ۔ کرسی تو دوسری تھی نہیں کہ بیٹھتا ۔ دونوں نے ایک نظر مجھے دیکھ لیا ۔ کچھ دیر کے بعد منٹو کو چوپڑہ صاحب کا چپراسی بلا کر لے گیا تو میں نے اُن لکھنوی حضرت سے کہا :

”مجھے ابھی معلوم ہوا ہے کہ آپ ہندی کے آدمی ہیں ۔ اس سٹیشن پر ہندی کے ایک پروگرام اسسٹنٹ کی بڑی ضرورت تھی ۔“

اور میں نے اُسے شام کو گھر پر چائے کے لیے مدعو کر دیا ۔

میں اُن دنوں ڈیس ہزاری میں رہتا تھا ۔ وہاں نزدیک ہی چھوٹی سی پہاڑی اور خوشنما جنگل ہے ۔ برسات کی شام تھی ۔ چائے پلا کر میں اُس لکھنوی احمق کو رج پر لے گیا ۔ بادل گھرے ہوئے تھے اور بڑی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی ۔ وہ لگاتار اپنی تعریفیں کرتا رہا کہ کس طرح اُس نے ڈرامے لکھے ، کس طرح چپ صاحب نے کہا کہ ویسا سکرپٹ (Script) ہندی میں کوئی نہیں لکھتا اور کس طرح انھوں نے اُس کی سفارش کر کے اُسے پروگرام اسسٹنٹ بنا دیا ۔ میں نے بھی اُسے خوب چنگ پر چڑھایا ۔ اُس کی شخصیت کی تعریف کی ۔ اُسے سمجھایا کہ اگر شروع ہی سے اُس نے اپنا سکہ جما دیا تو سب اُس سے خوف کھائیں گے ، نہیں آرٹسٹ تو اچھے سے اچھے کو بدھو بنا کر رکھ دیتے ہیں ۔ میں نے اُسے یہ بھی کہا کہ پی ۔ اے ۔ کا کام ہے کہ جو ڈرامے براڈ کاسٹ ہوں انھیں اچھی طرح پڑھے ، وٹ (Vett) کرے ۔ اُس نے کہا کہ وہ ایک بھی چیز پڑھے اور وٹ کیے بغیر براڈ کاسٹ نہ ہونے دے گا ۔

”اب جب آپ آ گئے ہیں اور ہندی جانتے ہیں“ ، میں نے کہا ، ”تو میں آئندہ ڈرامے آپ کی سہولت کے لیے ہندی رسم الخط ہی میں لکھوں گا ۔ باقی اردو مسودے ہی آئیں گے ، وہ آپ مجھ سے سن کر وٹ کیا کیجیے اور یوں اچھی طرح دیکھ کر براڈ کاسٹ کیجیے ، کیونکہ خراب ڈراما براڈ کاسٹ ہو تو ذمہ داری آپ کی ہوگی اور میٹنگ میں ڈانٹ آپ ہی کو پڑے گی ۔“

اس پر اس نے اپنی قابلیت کے بارے میں میرے علم کو اور بڑھایا اور بہت خوش خوش واپس ہوا ۔

اب شیڈیول تو تین مہینے پہلے بن جاتا تھا اور وہ کرشن بنا کر گیا تھا ۔ میں مہینے دوسرے مہینے ڈراما لکھتا اور منٹو کے دو تین ڈرامے ہر مہینے ہوتے تھے ۔ اگلا ڈراما منٹو کا تھا ۔ نام تھا (جہاں تک کہ مجھے یاد ہے) ’آوارہ‘ ۔ پلاٹ وغیرہ مجھے سب بھول گیا ہے ۔ اتنا یاد ہے کہ وہ ڈراما بھی منٹو کے اُن دنوں لکھے بیشتر ڈراموں کی طرح ایک ہی دن میں لکھا ہوا تھا ۔ دوسرے ہی دن اُس لکھنوی پی ۔ اے ۔ نے اُس کا مسودہ نکالا اور مجھے بلایا ۔ میں اُسے سٹوڈیو میں لے گیا اور وہاں جا کر اُسے سنانے لگا ۔ اُس کو زبان وغیرہ یا ڈرامے وغیرہ کی خاک سمجھ نہ تھی ۔ ڈراما سناتے سناتے میں کہتا :

”کیوں صاحب ، اس لفظ کی جگہ یہ لفظ ہو تو کیسا رہے گا ؟“

اور وہ کہتا :

”ہاں ہاں ، یہ بہتر ہے ۔“

اور میں لال پنسل کی مدد سے الفاظ اور محاورے بدلتا چلا گیا ۔ دو چار جگہ میں نے گول نشان لگا دیے ۔ میں نے ان حضرت سے کہا کہ راشد صاحب ان الفاظ کے سخت خلاف ہیں ۔ ان کے ساتھ ساں ڈیڑھ سال کام کر کے میں جان گیا ہوں ۔ میں ان کو نہیں بدلتا ۔ یہ وہ خود بخود بدل دیں گے اور اس طرح ان تبدیلیوں کی تمام تر ذمہ داری ان کی ہو جائے گی ۔ ڈرامے کا اختتام میں نے کاٹ دیا اور اُس کی جگہ تین اختتام تجویز کر دیے ۔

جیسا کہ میں نے سوچا تھا ویسا ہی ہوا ۔ اُس لکھنوی پی ۔ اے ۔ نے راشد پر بڑا رعب ڈالا کہ اس نے منٹو کا ڈراما پڑھا ہے ، بڑا خام ہے ۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

اُس نے بڑی محنت سے ویٹ کیا ہے ۔ راشد مسودہ دیکھیں اور پاس کریں تو براڈ کاسٹ ہو ۔ راشد تو منٹو سے پہلے ہی جلے بیٹھے تھے ، اُن کو اپنا پرانا بدلہ نکالنے کا موقع ہاتھ آیا اور انھوں نے وہ چند الفاظ بھی ، جن پر میں نے لال پنسل سے گول دائرے بنا دیے تھے ، بدل دیے ۔

جب منٹو کو معلوم ہوا کہ اُس کا ڈراما ویٹ ہوا ہے تو اُس کے سر پر خون سوار ہو گیا ۔ وہ ڈائریکٹر کے کمرے میں گیا اور اُس نے راشد اور لکھنوی پی ۔ اے ۔ کو بے لفظ سنائیں اور کہا کہ ڈراما ہوگا تو بنا ایک لفظ کٹے ہوگا ورنہ نہیں ہوگا ۔

میں اوپر لوبی کلارک ، انگریزی اناؤنسر ، کے کمرے میں بیٹھا کرتا تھا ۔ اڈوانی کے کمرے کا روشن دان میری آنکھوں کے سامنے پڑتا تھا ۔ نیچے اڈوانی کے کمرے میں منٹو کچھ اتنے زور سے چلا رہا تھا کہ میں اُٹھ کر روشن دان کے پاس چلا گیا اور جھک کر اندر کا نظارہ کرنے لگا ۔ راشد کہہ رہے تھے کہ اُنھوں نے خود ڈراما پڑھا ہے اور ہوگا تو انھیں تبدیلیوں کے ساتھ ہوگا ورنہ نہیں ہوگا اور ڈیوی ایشن (Deviation) یعنی جدول کے انحراف کی ذمہ داری اُن کی نہیں ہوگی ۔ جب ہم باہر والوں کی چیزیں ویٹ کر سکتے ہیں تو اپنے آرٹسٹوں کی کیوں نہیں کر سکتے ؟ اور منٹو پنجرے میں بند شیر کی طرح تلملا رہا تھا اور تقریباً دھاڑتے ہوئے کہہ رہا تھا کہ ڈراما ہوگا تو اسی روپ میں ہوگا ورنہ نہیں ہوگا ۔

مجھے منٹو کی اس تلملاہٹ کو دیکھ کر کچھ عجیب سی شیطانی مسرت ہوئی ۔ منٹو نے مجھے جتنی گالیاں دی تھیں ، میری ترقی کے راستے میں جو رکاوٹیں ڈالی تھیں ، اردو کا ٹائپ رائٹر میرے ہاتھ بیچتے ہوئے جو چالیس روپے جھوٹ بول کر زیادہ لے لیے تھے اور اوپر سے مجھے بنایا تھا اور جتنا بھی مجھے ستایا تھا اُس سب کا صلہ چند لمحوں کی اُس کی اس تلملاہٹ میں مجھے مل گیا ۔

”سنار دی ٹھک ٹھک ، لوہار دی اکّو سٹ ۔“ میں نے من ہی من میں پنجابی کا محاورہ دہرایا اور واپس اپنے کمرے کی طرف پھرا ۔

مجھے یاد نہیں اڈوانی نے کیا فیصلہ دیا تھا ، غالباً انھوں نے راشد پر سب کچھ چھوڑ دیا تھا اور پروگرام ڈائریکٹر کے کام میں مداخلت سے

انکار کر دیا تھا ۔ بہرحال ، ایک عجیب سی شیطانی مسرت سے معمور میں واپس آ کر کرسی پر بیٹھ گیا اور ٹانگیں میز پر پھیلا کر میں نے اطمینان کی سانس لی ۔

لیکن اُس مسرت اور اطمینان کے باوجود کچھ عجیب طرح کی تکلیف اور اُداسی کا احساس دل و دماغ پر طاری ہو گیا ـــــ آنکھوں کے سامنے منٹو کی تلملاہٹ ، اُس کے خوبصورت ماتھے پر پڑی ہوئی شکنیں ، اُس کی باہر کو نکلی ہوئی آنکھیں ـــــ سب کچھ گھوم گیا ـــــ اور اس تلملاہٹ کا باعث میں تھا ـــــ میں جو درحقیقت اُسے چاہتا تھا ، اُس کے پاس بیٹھنا چاہتا تھا ، اُس کے افسانوں کا اُس کے نام نہاد چاہنے والوں سے کہیں زیادہ مداح تھا ـــــ میں ، جس نے دو ایک مہینے پہلے اپنے ڈراموں کا دوسرا مجموعہ ”چرواہے“ اُس کے نام معنون کیا تھا ۔

’چرواہے‘ کا نسخہ میرے پاس پڑا ہے ۔ منٹو کے نام کیا ہوا انتساب میرے سامنے ہے ۔

منٹو کے نام

جو مجھے کبھی بہت اچھا لگتا ہے اور کبھی سخت برا

میرے اُس وقت کے جذبات کی کتنی صحیح تصویر یہ انتساب پیش کرتا ہے !

دوسرے دن میٹنگ میں ڈرامے کا قصہ پیش ہوا ۔ لکھنوی پی ۔ اے ۔ نے راشد کے کہنے پر ڈرامے کی تحریری تنقید پیش کی ۔ آل انڈیا ریڈیو ، دہلی کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ کسی ہونے والے ڈرامے کی تنقید میٹنگ میں ہو ۔ لیکن چونکہ ڈیوی ایشن کا سوال تھا ، اگر وہ ڈراما نہ ہو تو اس کی جگہ دوسرا ڈراما چننے کی بات تھی ، اس لیے راشد نے میٹنگ میں وہ بات اُٹھائی ۔ لکھنوی پی ۔ اے ۔ نے پہلے ہی سے وہ تنقید تیار کر رکھی تھی ، سو اُس نے پڑھ دی ۔ بہرحال ، منٹو کی تنقید ہو اور وہ بھی بھری میٹنگ میں ، یہ کبھی نہ ہوا تھا ۔ منٹو اس طرح اپنی تنقید سننے کا عادی نہیں تھا ۔ لکھنوی پی ۔ اے ۔ کی سمجھ کے بارے میں اُس نے دو تین تیز

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

باتیں کیں، اور تیز باتیں کہتے وقت منٹو کچھ سوچتا نہ تھا۔ مجھے بھی غصہ آ گیا اور میں نے کہا کہ یہ ڈراما میری نظر سے بھی گزرا ہے اور ان صاحب نے بالکل ٹھیک تنقید کی ہے —— اور چونکہ سب قطع برید میں نے کی تھی اس لیے میں نے بڑی صفائی سے اس ڈرامے کی کمزوریاں اُجاگر کر دیں۔

مجھے اب یاد نہیں منٹو نے کیا کہا، لیکن غصے میں اُس نے میری قابلیت کے بارے میں کوئی تیز بات کہی جس کا مطلب تھا کہ تکنیک کے ضمن میں تم کچھ نہیں جانتا اور پوچھا کہ تم اس سے بہتر لکھ کر دکھا سکتے ہو؟

میں نے اور بھی تیز لہجے میں کہا کہ میں تمھیں دس برس تک ڈراما لکھنا سکھا سکتا ہوں۔ تم اوپر میرے کمرے میں آؤ تو تمھیں بتاؤں ڈراما کیسے لکھا جاتا ہے اور یہ ڈراما بھی بہتر بنا کر دکھا دوں۔

بات بڑھ جاتی، لیکن شور سن کر اڈوانی صاحب اپنے کمرے سے آ گئے۔ طے ہوا کہ ڈراما تصحیح شدہ حالت میں ہوگا اور چونکہ اپنے آرٹسٹ کا سوال ہے اس لیے جدول سے انحراف نہیں ہوگا۔

منٹو میٹنگ کے بعد دفتر میں نہیں رکا۔ اُس نے ٹائپ رائٹر اُٹھایا اور چلا گیا۔ دوسرے دن بھی وہ دفتر نہیں آیا۔ دوپہر کو خورشید صاحب (سکریٹری انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ) کا فون آیا کہ منٹو کا ڈراما اگر براڈ کاسٹ کرنا مقصود ہو تو منٹو کے لکھے مسودے کے مطابق کیا جائے ورنہ رد کر دیا جائے۔

(ٹھیک واقعات مجھے یاد نہیں رہے۔ غالباً ڈراما خورشید صاحب نے منگوایا تھا اور پھر انھوں نے یہ پیغام بھیجا تھا۔ راشد چونکہ تُلے ہوئے تھے کہ وہ جدول سے انحراف نہیں ہونے دیں گے اور ڈراما تصحیح شدہ حالت میں کریں گے اس لیے منٹو نے خورشید صاحب کے ذریعے اسے کینسل کرا دیا تھا۔)

تیسرے دن بھی منٹو دفتر میں نہیں آیا۔ ڈراما اُس نے منگوا لیا۔ چوتھے یا پانچویں یا غالباً ساتویں دن سنا کہ وہ بمبئی چلا گیا ہے اور اسے فلم کمپنی میں پانچ سو کی جگہ مل گئی ہے۔

گرانٹ روڈ کو جاتے ہوئے وکٹوریہ میں میرے سامنے بیٹھے بیٹھے منٹو نے بتایا کہ نوکری ووکری اُسے کچھ نہیں ملی تھی اور بمبئی میں اُسے خاصی تکلیف ہوئی۔ بیوی کو وہ دہلی ہی میں چھوڑ آیا تھا۔ بعد میں 'فلمستان' میں اُسے ساڑھے تین سو کی نوکری ملی تو غالباً اُس کا دوست نذیر جا کر اُس کی فیملی کو بمبئی لے آیا۔

"وہ تمھارا لال کیا ہوا مسودہ اب بھی میرے پاس محفوظ ہے۔" اچانک منٹو نے کہا۔

یعنی جس طرح مجھے نہ راشد پر غصہ تھا نہ اُس لکھنؤی پی۔ اے۔ پر بلکہ منٹو پر تھا —— اسی طرح منٹو کو بھی اُن دونوں کی بجائے مجھی پر غصہ تھا۔ اُس کا ڈراما میں نے کاٹا ہے، یہ بات وہ جان گیا تھا۔

"اب تمھارے کیا ارادے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

منٹو چپ رہا۔

"دیکھو، دہلی کی دہلی میں رہی۔ اگر ہمیں اسی طرح لڑنا ہے تو مجھے 'فلمستان' کی نوکری منظور نہیں۔ وہاں ساڑھے تین سو پاتا ہوں، آرام سے ہوں۔ یہاں پانچ سو بھی ملے اور چخ چخ رہی تو کیا فائدہ؟"

"نہیں نہیں۔ ویسا کچھ نہیں ہوگا۔"

اور اُس نے انگریزی میں فقرہ پورا کرتے ہوئے کہا:

"I Like you, though I hate you."

اُس دن گھر آ کر میں نے صفیہ بھابی سے کہا:

"دیکھیے، منٹو نے مجھے بمبئی بلایا ہے۔ میں نہیں آ رہا تھا۔ دو بار تار دینے پر آیا ہوں۔ منٹو نے باتوں باتوں میں بتا دیا ہے کہ وہ 'آوارہ' کا مسودہ سنبھالے ہوئے ہے اور دہلی کے اس واقعے کو نہیں بھولا۔ ہم دہلی میں لڑتے رہے ہیں اور لوگوں کے لیے تماشا بنے ہیں۔ اب اس نے مجھے بمبئی بلایا ہے تو آپ اسے سمجھا دیجیے کہ مجھے یہاں تنگ نہ کرے، کیونکہ وہ تنگ کرے گا تو میں بھی تنگ کروں گا اور آخر ہم دونوں تنگ ہوں گے۔"

منٹو اور صفیہ بھابی نے مجھے یقین دلایا کہ ویسی کوئی بات نہیں

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

ہوگی ، اور میں نے اگرچہ کانٹریکٹ پر دستخط نہیں کیے لیکن 'ہاں' کر دی - لیکن جب بعد میں ؑمیں نے سوچا تو میں نے طے کیا کہ میں حتی الامکان اس بات کا موقع ہی نہ آنے دوں گا کہ منٹو سے میری لڑائی ہو - اور بمبئی میں جتنے میرے واقف کار تھے اُن سے مل کر میں نے 'فلمستان' ، اُس کے کرتا دھرتا ششدھر مکرجی اور وہاں کے طریق کار کے بارے میں واقفیت حاصل کی - میں خاص طور پر اُن لوگوں سے ملا جو منٹو کے ساتھ کام کرتے تھے اور اب وہاں نہیں تھے - مجھے تین چار اہم باتوں کا پتا چلا :

۱ - فلمستان کا باس مکرجی زمانۂ قدیم کے سادیت پسند اُن داروغوں جیسا ہے جو غلاموں کو کوڑے مار مار اُن سے کام لیتے تھے -

۲ - فلمستان میں منٹو کا ایک چھتر راج ہے -

۳ - جب سال بھر پہلے شاہد لطیف نے میرا نام تجویز کیا تھا تو منٹو نے فلمستان میں میرے آنے کی مخالفت کرتے ہوئے کہا تھا کہ اشک بڑا خطرناک آدمی ہے -

۴ - فلمستان میں ایک ہی منظر کو سب مکالمہ نویس لکھتے ہیں - منٹو سب کے مکالمے پڑھتے ہیں اور سب کو رد کر کے خود لکھتے ہیں ـــــ ظاہر ہے کہ وہ سب سے اچھا ہوتا ہے - اسی طرح انھوں نے شاہد لطیف اور سنتوشی کو فلمستان چھوڑنے پر مجبور کر دیا جب کہ شاہد لطیف ہی منٹو کو فلمستان میں لے گیا تھا -

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب ایک سال پہلے منٹو مجھے خطرناک سمجھتا تھا تو سال بھر بعد ؑمیں کس طرح بے ضرر ہو گیا ؟ خود اُس نے ہی مجھے وہاں بلوایا - حقیقت یہ ہے کہ جب منٹو نے فلمستان میں کام کرنے کے لیے خط لکھا تھا تو خود میں نے اپنے آپ سے یہی سوال کیا تھا اور پہلی بار میں نے جانے سے انکار کر دیا تھا ، لیکن ایک مہینے بعد جب منٹو نے مجھے تار دیا کہ انٹرویو کو آؤ اور سیکنڈ کلاس کا کرایہ کمپنی دے گی تو چونکہ کوشلیا ٹریننگ لینے بمبئی جا رہی تھی لہذا میں بھی تیار

ہو گیا - خیال تھا کہ اور کچھ نہ سہی بمبئی کی سیر ہی ہو جائے گی - لیکن وہاں جانے کا فیصلہ کرنے کے باوجود میں سوچتا تھا کہ آخر منٹو نے مجھے کیوں بلایا ہے ؟ اُس وقت میں جس نتیجے پر پہنچا تھا اُس میں مجھے بمبئی میں منٹو سے ملنے اور وہاں کے حالات جاننے پر تھوڑی سی ترمیم کرنی پڑی ، لیکن اُس بنیادی وجہ میں فرق نہیں پڑا - چونکہ اس قصے کا ایک نفسیاتی پہلو بھی ہے ، اور خاصا دل چسپ ہے ، اس لیے میں اس کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں -

جیسا کہ میں نے پہلے کہا ، مجھے منٹو سے نفرت نہ تھی - نفرت یا محبت کے لیے کچھ وقت کا ساتھ ناگزیر ہے اور میں تو دہلی آنے سے پہلے منٹو سے ملا بھی نہ تھا - اور جب ملا تو پہلی ملاقات میں جہاں تک شکل و صورت کا تعلق ہے ، وہ مجھے اچھا لگا تھا ـــــ گورا چٹا رنگ ، پتلا چھریرا جسم ، فراخ پیشانی ، ستواں ناک ، بڑی بڑی آنکھیں اور ہونٹوں پر استہزاء آمیز مسکراہٹ ـــــ منٹو کی یہی پہلی جھلک ہے جو میرے ذہن میں محفوظ ہے - اس دوران میں ؑمیں 'منتر' ، 'نیا قانون' اور شاید 'مسز ڈی کوسٹا' پڑھ چکا تھا اور یہ افسانے مجھے بے حد اچھے لگے تھے اور منٹو نے میرے دل میں ایک مترجم کی بجائے ایک ذہین افسانہ نگار کی حیثیت سے جگہ بنا لی تھی - لیکن دہلی میں میرے آنے سے پہلے ہی ہمارے لیے جو پارٹ ڈھل گئے تھے اُن سے نجات نہیں ملی - ہمیں ایک دوسرے کا حریف ہونا تھا اور ہم باہم حریف ہو کر رہے -

لیکن جب منٹو اچانک دہلی سے چلا گیا تو مجھے بڑا افسوس ہوا - کرشن لکھنؤ تبدیل ہو گیا تھا ، اخترالایمان کو راشد نے جواب دلوا دیا تھا - چلڈھا ، میراجی اور راجہ مہدی علی خاں ، راشد کی خوشامد میں لگے رہتے تھے اور راشد چونکہ مجھے کرشن کا آدمی سمجھتے تھے اس لیے مجھے تنگ کرنے کے درپے تھے - منٹو کی غیر موجودگی مجھے بہت شاق گزرتی تھی - یہ ٹھیک ہے کہ منٹو کے رہنے پر کبھی کبھی جھڑپ ہو جاتی ، خاصی چپقلش بھی رہتی تھی لیکن اچھے سے اچھا لکھنے میں مدد بھی ملتی تھی اور ایک عجیب سی قربت کا احساس رہتا تھا ـــــ منٹو کے بمبئی جانے کے بعد اُس کی اور اُس کے افسانوں کی تعریف نہ کرنے کے سلسلے میں ؑمیں نے اپنے اوپر زبردستی جو قید لگا رکھی تھی اُسے ڈھیلا کر دیا

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

—— منٹو کے بمبئی جانے کے سال ڈیڑھ سال بعد —— ٹھیک سنہ مجھے یاد نہیں، اُس کا افسانہ "بو" شائع ہوا۔ اس افسانے کے شائع ہوتے ہی اس کے خلاف ایک شور برپا ہو گیا۔ چودھری نذیر احمد نے اس کے بارے میں میری بھی رائے مانگی۔ میں نے 'بو' کی خوب تعریف کی۔ مجھے 'بو' کے کنٹنٹ سے غرض نہ تھی، میں اس افسانے کی تکنیک پر فدا تھا۔ ایک بڑی نازک سی تھیم کو منٹو نے جس چابک دستی سے 'بو' میں سمویا ہے وہ نہ صرف قابلِ داد ہے بلکہ قابلِ تقلید بھی ہے۔ میں وہ افسانہ اپنے کئی دوستوں کو سنا چکا ہوں جن میں ہندی کے مشہور افسانہ نگار یشپال بھی شامل ہیں اور یشپال میری رائے سے متفق ہیں۔ ہر ہندی افسانہ نگار کو میرا مشورہ ہے کہ افسانے کی تکنیک کو جاننے کے لیے وہ 'بو' ضرور پڑھے۔ تکنیک کے کمال کے لحاظ سے اُس کے جوڑ کا افسانہ بیدی کا "لاجونتی" ہے۔ اس کے علاوہ کوئی دوسرا افسانہ اردو ادب میں اُس کی ٹکر کا مجھے دکھائی نہیں دیتا۔ 'لاجونتی' میں ہیئت ہی نہیں کنٹنٹ کا بھی کمال ہے۔"

بہرحال مجھے خیال ہوتا ہے کہ 'بو' کے بارے میں جو خط میں نے چودھری نذیر احمد کو لکھا اُس نے منٹو سے اس کا ذکر کیا یا اُس کا خلاصہ انھیں بھیج دیا۔ کیونکہ جب میں بمبئی گیا تھا تو منٹو نے اس کا ذکر کیا تھا۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ اُس خط کے بعد میرے بارے میں منٹو کا رخ کچھ ڈھیلا ہو گیا اور یہی وجہ ہے کہ جب ڈائریکٹر لتن بوس فلمستان میں ایک فلم بنانے آئے اور ایک نئے مکالمہ نویس کو رکھنے کی بات چلی تو منٹو ہی نے میرا نام تجویز کیا۔

لیکن ایک دوسری وجہ بھی تھی، غیر شعوری طور پر جس کا مجھے احساس تھا اور جس کی تصدیق بمبئی میں ہوئی۔ منٹو اگر شراب نہ پیے ہوتا اور دہلی کے واقعے کا ذکر کرتے ہوئے 'آوارہ' کے اُس مسودے کا ذکر نہ کرتا، جسے میں نے کاٹ چھانٹ دیا تھا، تو میں اسی خوش فہمی میں مبتلا رہتا کہ میری طرف سے منٹو کے دل میں جو کدورت تھی وہ دھل گئی ہے۔ منٹو ڈھیلا پڑ گیا تھا لیکن وہ اس واقعے کو فراموش نہ کر سکا تھا۔ سال بھر پہلے فلمستان میں اُس کی پوزیشن اتنی مضبوط نہ تھی۔ اُس وقت میں وہاں جاتا تو اگر میرا یا شاہد کا یا میرا یا سنتوشی

کا گٹ بن جاتا تو منٹو کو تکلیف ہوتی، اس لیے اُس نے میری مخالفت کی۔ جس وقت اُس نے مجھے بلایا اُس وقت شاہد لطیف اور سنتوشی فلمستان چھوڑ چکے تھے اور منٹو، مکرجی کی ناک کا بال بنا ہوا تھا۔ مجھے دوستوں نے بتایا کہ منٹو تمھارے مکالموں کے پرخچے اُڑا دے گا۔ تم تنخواہ ضرور اچھی پاؤ گے لیکن تمھاری جان ضیق میں آجائے گی۔" اور میں سمجھ گیا کہ میں نے اُس کے ڈرامے کی جو دھجیاں اُڑائی تھیں اُس کا انتقام لینے کی ترکیب اُس نے یوں نکالی تھی۔ اور چونکہ میں 'ہاں' کر چکا تھا اور دہلی میں مشہور ہو گیا تھا کہ میں نے فلم کی نوکری کر لی ہے اس لیے میں واپس تو نہ گیا لیکن میں نے فلمستان میں اپنا لائحہ عمل طے کر لیا۔

میں نے اُس وقت تک کنٹریکٹ پر دستخط نہ کیے جب تک فلمستان میں مجھے الگ کمرہ اور الگ میز کرسی نہیں مل گئی (یہ پہلی احتیاط تھی کہ منٹو میں اور مجھ میں جھگڑے کی نوبت نہ آئے۔) اور یہ طے نہیں ہو گیا کہ صرف میں ہی لتن بوس کے لیے مکالمے لکھوں گا اور میں ہی ڈائیلاگ ڈائریکشن کروں گا۔

میرا پہلا فلم "مزدور" تھا اور دوسرا "سفر" جسے مترا نے ڈائریکٹ کیا۔ نہ صرف پہلے کے بلکہ دوسرے کے مکالمے بھی میں نے لکھے اور یوں فلمستان میں ڈیڑھ سال نسبتاً آرام سے گزر گیا۔ منٹو کو اس بات کا قلق ضرور رہا کہ میں نے اُس کی چال کاٹ دی لیکن میں نے اپنی عادت کو جانتے ہوئے نت جھگڑے کے بدلے اس بات کا انتظام کر لیا کہ جہاں تک ممکن ہو اس سے بچا جائے۔

لیکن میری تمام احتیاط کے باوجود آخر منٹو مجھے ایک چوٹ پہنچانے میں کامیاب ہو گیا۔ میرا پہلا فلم 'مزدور' خواہ باکس آفس پر کامیاب نہ رہا تھا لیکن میرے مکالمے ۱۹۴۵ء کے بہترین ڈائیلاگ سمجھے گئے تھے اور مجھے ایک سند بھی مل گئی تھی۔ میرا دوسرا فلم 'سفر' باکس آفس پر بھی کامیاب رہا اور ظاہر ہے میرا کریڈٹ بھی بڑھ گیا۔ تب اشوک کمار نے اپنا الگ فلم پروڈیوس کرنے کی خواہش ظاہر کی اور مکرجی مان گئے۔ منٹو کے دونوں فلم "چل چل رے نوجوان" اور "شکاری" دو دو سال لینے کے باوجود ناکام رہے تھے اس لیے اشوک کمار میرے پاس آئے اور

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

انھوں نے مجھ سے ایک کہانی لکھنے کی فرمائش کی ۔ میں نے اُن کو دو تین پلاٹ ، جو میرے ذہن میں تھے ، سنائے ۔ اشوک نے ایک پسند کر لیا اور مجھے کہا کہ میں ایک خاکہ سا لکھ ڈالوں ۔ لیکن میں نے کہا کہ لکھنے سے پہلے ایک شرط واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں کہانی لکھنے کا دو ہزار روپیہ پیشگی لوں گا ۔ میں اُس وقت پونے سات سو کے قریب تنخواہ پا رہا تھا لیکن میرا کہنا تھا کہ میں مکالمہ نویس کی حیثیت سے ملازم ہوں کہانی نویس کی حیثیت سے نہیں ۔ کہانی لکھوں گا تو اُس کا دو ہزار لوں گا اور ڈائیلاگ نوکری کے کھاتے میں لکھوں گا۔ اگرچہ اشوک کمار ، مکرجی کا سالا تھا لیکن اُن دنوں سالے بہنوئی کے تعلقات کچھ کشیدہ تھے ۔ اشوک کمار نے کہا کہ آپ مکرجی سے کہیے ۔ لیکن مکرجی مجھ سے خوش نہ تھے ، میں نے انکار کر دیا ۔ تب اشوک نے کہا کہ میں سیٹھ چنی لال سے کہوں گا ، آپ بات کر لیجیے گا ، لیکن اس دوران میں آپ ایک خاکہ ضرور لکھ ڈالیے ۔

منٹو کو یہ خبر مل گئی کہ اشوک میرے پاس پہنچا ہے اور میں دو ہزار روپیہ مانگ رہا ہوں تو اُس نے واچا کو ساتھ ملا لیا ۔ واچا اشوک کو اپنے فلیٹ پر لے گئے ۔ شراب واچا کے ہاں اعلیٰ قسم کی رہتی تھی ۔ اشوک کو انھوں نے اُس وقت تک نہ آنے دیا جب تک یہ طے نہیں کر لیا کہ منٹو نئے فلم کی کہانی لکھے گا اور دوسرے دن اُس کا مہورت ہو جائے گا ۔

چونکہ کہانی کوئی تیار نہ تھی اور مہورت ہو گیا تھا اس لیے "آٹھ دن" کے فلمانے کے سلسلے میں کیا کیا دقتیں پیش آئیں ، یہ ایک الگ لمبی کہانی ہے ۔ لیکن چونکہ منٹو نے یہ جانتے ہوئے کہ میں نے الگ سے معاوضہ مانگا تھا ، بغیر معاوضہ لیے ہوئے افسانہ لکھ دینا منظور کر لیا (یہ اور بات ہے جب آدھی فلم بن گئی تو اُس نے پریشان کرنا شروع کیا اور کہانی کی مد میں بھی کچھ معاوضہ لے لیا ۔) اور اچھی خاصی سازش کر کے میرا پتا کاٹ دیا ، اس لیے مجھے بہت برا لگا —— خصوصاً اُس وقت جب میں افسانے کا خاکہ لکھ کر اشوک کے آنے کا انتظار کر رہا تھا —— مہورت ہو گیا ۔ مکرجی مجھ سے خوش نہ تھے ، اس لیے سوائے اس کے کہ

میں زہر کا گھونٹ پی کر چپ رہ جاتا اور کچھ نہ ہو سکتا تھا ۔

لیکن کچھ ہی دن بعد میں نے منٹو سے بدلہ لینے کی ترکیب نکال لی ۔ 'آٹھ دن' کا ڈائرکٹر فلمستان کا ایڈیٹر دتا رام پائی مقرر ہوا تھا ۔ اگرچہ ڈائریکشن تو اشوک ہی کرتا تھا لیکن چونکہ بڑا قابل ایڈیٹر تھا اس لیے اُس کی چلتی تھی ۔ میں نے پائی کو ساتھ ملایا اور 'آٹھ دن' میں پنڈت طوطا رام کا ایک مزاحیہ رول لے لیا ۔ جب کہانی شروع ہوئی تھی تو یہ دو ایک مناظر کا معمولی رول تھا لیکن میں نے اس خوبی سے اپنا پارٹ کیا اور بغیر ری‌ٹیک (Retake) کے کیا کہ اشوک کو بہت پسند آیا اور اُس نے طے کیا کہ یہ رول بڑھا کر سارے فلم میں رکھا جائے ۔ اس کے علاوہ پنڈت طوطا رام چونکہ ہندی بولتا تھا اس لیے پنڈت کے سب ڈائیلاگ میں لکھتا تھا ۔ منٹو ایک لائن لکھتا تو میں چار کر دیتا ، منٹو ایک سین لکھتا تو میں اُس کے دو کر دیتا ۔ مجھے سٹیج ایکٹنگ تو پسند ہے لیکن فلم ایکٹنگ کو فلم ناٹک کی طرح میں کوئی اہمیت نہیں دیتا لیکن منٹو کو پریشان کرنے کے لیے وہ مضحکہ خیز رول میں کرتا رہا اور منٹو اتنا پریشان ہوا کہ ایک دن سیٹ پر ہاتھا پائی کی نوبت آ گئی ۔

اور اس بار ہم دونوں ساتھ ساتھ فلمستان سے الگ ہوئے ۔ اور اگرچہ اشوک اور واچا منٹو کے دوست تھے اور منٹو ان کے ساتھ بمبئی ٹاکیز میں چلا گیا (جسے اشوک نے مکرجی سے علیحدہ ہو کر خرید لیا تھا ۔) لیکن منٹو وہاں ایک بھی کہانی نہ دے سکا ۔ جب میں پنج گنی سے الہ آباد آتے ہوئے اشوک سے ملا ، میں نے پوچھا کہ منٹو کیوں چلا گیا تو اُس نے کہا کہ اُس نے کہانی لکھی تھی لیکن ہم نے کمال امروہی کی کہانی "محل" لینے کا فیصلہ کر لیا ۔ منٹو کچھ کہے بغیر چلا گیا حالانکہ ہم نے کہا تھا کہ اس کے بعد تمھارے والی کہانی بنائیں گے ، لیکن اُس نے نہیں سنا ۔

درحقیقت ساؤنڈ ریکارڈسٹ واچا (جو منٹو کا دوست تھا) اور بمبئی ٹاکیز کے مالک واچا میں فرق تھا ۔ اور منٹو ایسے آدمیوں میں گھر گیا جنھیں کبھی اس نے فلمستان چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا ۔ اور جب اُس نے

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

دیکھا کہ آگل راستہ بند ہے، کار موٹر نہیں چلے گی تو وہ باجو کی گلی سے پاکستان چلا گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کلیدی آسامیوں پر مسلمانوں کے آنے کی وجہ سے ایک دو چٹھیاں اشوک اور واچا کو ملی تھیں، لیکن سٹوڈیو کو آگ لگانا اور خود بے کار ہو جانا آسان نہیں۔ اس کا اثر نہ شاہد لطیف نے لیا نہ نذیر اجمیری نے۔ منٹو کے بددل ہونے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ پہلی کہانی نذیر اجمیری کی چنی گئی اور دوسری کہانی کمال امروہی کی۔ جس دن کمال امروہی کی کہانی کا پتا چلا منٹو نے بمبئی چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا!"

لیکن منٹو کی اس رن چھوڑیت اور باری صاحب کی رن چھوڑیت میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ باری صاحب کی رن چھوڑیت میں غالباً بزدلی کا عنصر تھا جب کہ منٹو کی رن چھوڑیت اُس کی زبردست انانیت کے باعث تھی۔ اور اس کی اسی انانیت میں اُس کی عظمت کا راز مضمر ہے۔ منٹو کو خوشامد کرنے سے عار نہیں تھا۔ مکرجی کے پاس بیٹھ کر اُن کی خوشنودی کے لیے منٹو کو غالب کے اشعار سناتے میں نے دیکھا ہے (حالانکہ میں سمجھتا ہوں مکرجی کے سامنے غالب کے شعر پڑھنا بھینس کے آگے بین بجانا ہے۔ اس سے مکرجی کی عظمت کم نہیں ہوتی، اپنے فن میں ان کا کوئی ثانی نہیں لیکن غالب کو سمجھنا اُن کے بس کی بات نہیں۔ اور پھر بنگالی ہونے کے ناتے بنگال کا چھوٹے سے چھوٹا شاعر اُن کے نزدیک غالب سے بڑا ہے!)، اشوک اور واچا کی محفل میں بیٹھ کر سوقیانہ لطیفے سناتے دیکھا ہے، اَن پڑھ ایکٹروں اور میوزک ڈائریکٹروں کی محفل میں بڑی سرگرمی سے بکواس کرتے سنا ہے (جسے منٹو 'بکواس' اور دوسرے بذلہ سنجی کا نام دیتے تھے۔) لیکن ان میں سے کسی بھی کام میں اُس کی 'انا' کو ٹھیس نہیں پہنچی، کیونکہ اول تو یہ کہ وہ اُن کو اپنے سے کہیں کمتر سمجھتا رہا اور دوسرے یہ کہ سب لوگ خواہ منٹو کو سنکی سمجھتے ہوں، شرابی سمجھتے ہوں لیکن اول درجے کا ڈائیلاگ رائٹر سمجھتے تھے۔ آل انڈیا ریڈیو کی اُس میٹنگ میں، جہاں راشد نے، میں نے اور اس لکھنوی پی۔ اے۔ نے اس کے ڈرامے کی "تنقید" کی، اور بمبئی ٹاکیز کے سٹوڈیو میں، جہاں اشوک اور واچا، اُس کے جگری دوستوں، نے اُس کی کہانی کے مقابلے میں نذیر اجمیری اور کمال امروہی کی کہانیاں

لے لیں، منٹو کی انانیت کو زبردست ٹھیس پہنچی۔ اور جب اُس کی انانیت کو ٹھیس لگی تو پھر وہاں اُس کے لیے ٹھہرنا مشکل ہو گیا۔ کوئی موٹی کھال والا ابن الوقت مصنف ہوتا تو ہتک برداشت کرتا ہوا بھی وہیں پر جما رہتا، لیکن منٹو کی انانیت کے لیے وہ ہتک ناقابلِ برداشت تھی اور چونکہ پٹ کر پیٹ دینے کے فن میں وہ ماہر نہیں تھا اس لیے دونوں بار میدان چھوڑ کر بھاگ گیا۔ دونوں بار اُسے سخت تکلیف ہوئی۔ دوسری بار تو اُس کی جان پر آ بنی لیکن تکلیف کے خوف سے اپنی انانیت کو ٹھیس لگنے دینا اُس نے منظور نہ کیا۔"

"پارٹی ہو، میٹنگ ہو (فارمل یا انفارمل) منٹو ہمیشہ پیش پیش رہنا پسند کرتا تھا۔ اگر کسی پارٹی یا محفل میں کوئی دوسرا آدمی لوگوں کی توجہ مبذول کر لے تو وہ بڑی خاموشی سے بغیر کسی کو بتائے کھسک جاتا تھا۔ یُوں تو فلمستان میں اپنی ملازمت کے شروع کے دنوں میں، جب میں نے کنٹریکٹ پر دستخط نہ کیے تھے اور میری شرطیں مکرجی نے ابھی منظور نہ کی تھیں اور میں مکرجی کو غالب کے بجائے مہادیوی ورما کے گیت سنایا کرتا تھا، میں نے منٹو کی انانیت کے اس پہلو کو دیکھا تھا، لیکن اس سلسلے میں ایک خاص واقعہ ہے جسے میں بھول نہیں سکا۔

۱۹۴۵ء یا ۱۹۴۶ء کے اواخر کا ذکر ہے، ٹھیک مہینہ مجھے یاد نہیں۔ بمبئی میں امریکہ کا (یا انگلستان کا، یہ بھی مجھے یاد نہیں۔) ایک مشہور ایکٹر آیا تھا۔ میں نے اُس ایکٹر کا صرف ایک فلم دیکھا تھا جس میں وہ موٹر سائیکل ریس میں شامل ہوتا ہے اور ایسی حرکتیں کرتا ہے کہ دیکھنے والے ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہو جاتے ہیں۔ بہر حال بمبئی میں وہ ایک دو سٹوڈیوز میں گیا۔ رائے بہادر چنی لال نے اُسے فلمستان میں بھی مدعو کیا۔ شام کو فلمستان کی کنٹین میں، جو کھلے میں بنی تھی اور چھت کے باوجود تین طرف سے کھلی تھی، میزیں لگا دی گئیں اور ششدھر مکرجی، گیان مکرجی، اشوک، واچا، چتلکر، برمن، نیپالی وغیرہ اکٹھے ہوئے۔ چونکہ اُس ایکٹر کو ہمارے ہاں آنے سے پہلے فلم پروڈیوسرز ایسوسی ایشن میں جانا تھا اس لیے اُسے دیر ہو گئی۔ بڑے مکرجی اُٹھ گئے، باقی لوگ وہیں بیٹھے گپ شپ کرتے رہے۔ منٹو حسبِ معمول یاسز

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

(Bosses) کے ساتھ بیٹھا بقول شیام اپنی بذلہ سنجی اُن پر ضائع کرتا رہا ۔ میں ، لیہالی ، برمن وغیرہ کے ساتھ بیٹھا تھا ۔ آخر ایکٹر صاحب اپنی بیوی کے ساتھ تشریف لائے ۔ لمبوترا سا منہ —— جیسے کسی نے دونوں جبڑوں کو شکنجے میں کس کر چپٹا کر دیا ہو ، بالکل ویسا ہی جیسا فلم میں دیکھا تھا ۔ اُن کی بیوی بڑی حسین تھی ۔ ظاہر ہے کہ روپے اور نام کی کشش نے اُس حور کو اُس لنگور کے پہلو میں لا بٹھایا تھا ۔ بہر حال اُس کے آگے آگے رائے بہادر چنی لال اور مکرجی آئے ۔ کنٹین میں ایک بڑی میز بچھی تھی اور اُس کے ساتھ ساتھ چھوٹی میزیں لگی تھیں ۔ بڑی میز مہمانوں اور کمپنی کے باسز کے لیے تھی اور چھوٹی میزوں پر دوسرے لوگ بیٹھے تھے ۔ میں نیپالی وغیرہ کے ساتھ ایک چھوٹی میز پر جا بیٹھا ۔ منٹو ، اشوک اور واچا کے ساتھ بڑی میز پر بیٹھا رہا ۔ لیکن ایک تو اُس ایکٹر کے ساتھ آنے والے لوگ زیادہ تھے ، دوسرے رائے بہادر کے ساتھ بھی چند مہمان تھے ۔ اشوک اور گیان مکرجی مالکوں میں سے تھے ۔ مکرجی نے واچا اور منٹو کو اشارہ کیا کہ وہ چھوٹی میز پر جا بیٹھیں ۔ واچا اُٹھ کر چھوٹی میز پر چنتلکر کے پاس جا بیٹھا ۔ اُس نے منٹو کو بھی اپنے پاس بٹھانا چاہا لیکن منٹو نہیں بیٹھا ۔ اس افراتفری میں ، جب مہمان بیٹھ رہے تھے ، منٹو چپ چاپ کھسک گیا ۔ میں یہ سب تماشا دیکھ رہا تھا ۔ جب وہ میرے پاس سے گزرا تو میں نے کہا : " کیوں ؟"

" چلو چلیں ۔"

" کیوں ؟"

" سب بکواس ہے ۔"

" بیٹھو ۔" میں نے کہا ، " جہاں اس بکواس کے انتظار میں ڈیڑھ گھنٹہ بیٹھے ہیں وہاں آدھ گھنٹہ اس کے ساتھ بیٹھ لیتے ہیں ۔"

لیکن منٹو نہیں رکا ، خاموشی سے کنٹین سے نکل گیا ۔

'گنجے فرشتے' میں منٹو نے شیام پر سکیچ لکھا ہے ۔ اُس میں اس کی انانیت کے اس پہلو کی جھلک بار بار ملتی ہے ۔ لاہور میں شیام آیا تو اُس کے ملنے والے اتنے تھے اور وہ لوگوں کی توجہ کو اس طرح کھینچے ہوئے تھا کہ منٹو کی 'انا' کو بار بار ٹھیس لگتی تھی ۔ منٹو لکھتا ہے :

" شیام نے مجھ سے کہا —— میرے ساتھ رہو ۔ لیکن اس کے دماغ کی مضطرب کیفیت کے احساس نے مجھے سخت پراگندہ کر دیا ۔ اُس سے وعدہ کر کے کہ رات کو میں اُس سے فلیٹی ہوٹل میں ملوں گا ، چلا گیا ۔"

لیکن جیسا کہ میں نے منٹو کو دیکھا اور جانا ہے ، منٹو کے چلے جانے کی وجہ (باوجود اُس کے دیرینہ دوست کی اس خواہش کے کہ وہ اس کے ساتھ رہے) اور کچھ نہ تھی ، اُس کی انا تھی ۔ اُس کی اس الجھن اور گھٹن کو میں نے اُس امریکی (یا انگریزی) ایکٹر کی آمد پر بھی محسوس کیا ۔ مکرجی نے جب منٹو کو اُٹھ جانے کا اشارہ کیا تو وہ یک لخت اُداس ہو گیا اور پھر وہاں بیٹھنا اُس کے لیے مشکل ہو گیا ۔ منٹو شیام سے ملنے فلیٹی ہی گیا ، لیکن اس ملاقات کا حشر بھی پہلی ملاقات سے مختلف نہ ہوا اور منٹو اور بھی چڑ کر واپس آ گیا ۔ بمبئی میں جب وہ شیام سے ملتا تھا تو عموماً شیام نہیں منٹو لوگوں کی توجہ کا مرکز ہوتا تھا ، کیونکہ ایکٹروں ، ڈائریکٹروں میں وہ اپنی قابلیت ، لطیفہ گوئی اور بذلہ سنجی سے سننے والوں کی توجہ کو اپنی طرف لگائے رکھتا تھا ، لیکن لاہور کی ان دو ملاقاتوں میں سننے والے آرٹسٹ نہیں تھے ، عام لوگ تھے جن میں سے شیام کو سب جانتے تھے اور منٹو کو جو چند ایک جانتے تھے وہ بھی ہنگامی طور پر بھول گئے تھے ۔ اور میں اچھی طرح جانتا ہوں ، اس بات سے منٹو کو ، جو اپنے آپ کو سب سے برتر سمجھتا تھا ، کتنی کوفت ہوئی ہوگی ۔

منٹو جس طرح پیٹنا جانتا تھا لیکن پٹنا نہیں ، پدانا جانتا تھا لیکن پدنا نہیں اُسی طرح مذاق کرتا تھا لیکن مذاق برداشت کرنے کی حس اُس میں مفقود تھی ۔ وہ بہت ذکی الحس تھا ۔ (اپنے مضامین میں بار بار اُس نے اس کا ذکر کیا ہے ۔) لیکن دوسرے بھی ذکی الحس ہو سکتے ہیں ، دوسروں کو بھی بات چبھ سکتی ہے ، اسے وہ اونچے درجے کا افسانہ نگار اور ماہر نفسیات ہونے کے باوجود نہ جانتا تھا ۔ کبھی کبھی مجھے اس بات کا بھی خیال آتا تھا لیکن انسان کی یہ عام خامی ہے کہ النساتی کئی بار نفس سے اندھے ہوئے لیکن اپنے افسانوں اور ناولوں میں

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

انھوں نے اس کے خلاف لکھا۔ بالزاک نے اپنے افسانوں اور ناولوں میں زندگی کی بے شمار حقیقتوں کو بے نقاب کیا ہے لیکن اپنی ذاتی زندگی میں وہ اتنی سی حقیقت نہ سمجھ سکے کہ انھیں روپیہ بے دریغ اور بیکار چیزوں پر نہ خرچ کرنا چاہیے، ہوائی قلعے نہ بنانے چاہییں اور بے دریغ قرض نہ لینا چاہیے ـــــ صفحۂ قرطاس پر زندگی کی دبی چھپی حقیقتوں کو عظیم فن کار کی چابک دستی سے قلم بند کرنے والا زندگی بھر عیاں حقیقتوں کو نہ سمجھ سکا اور بے حد پریشان رہا۔ آج میں یہ سب اچھی طرح سمجھتا ہوں لیکن اُن دنوں حقیقت نگار ہونے کا دعویٰ کرنے کے باوجود میں زندگی کی اس بڑی حقیقت کو نہ جانتا تھا۔

میں جن دنوں دہلی گیا منٹو کی ایک کہانی کا بڑا چرچا تھا ـــــ اُس کا نام تھا "ترقی پسند" ـــــ چرچا اُس کا یوں تھا کہ منٹو نے وہ دیوندر ستیارتھی اور بیدی پر لکھی تھی۔ چونکہ بیدی میرے بہت نزدیک تھا اس لیے پہلی فرصت میں "میں نے منٹو کی وہ کہانی پڑھ ڈالی۔ کہانی میں جو قصہ درج تھا وہ مجھے معلوم تھا، کیونکہ بیدی مجھے بتا چکا تھا۔ بات یہ تھی کہ لوک گیت لکھتے لکھتے ستیارتھی ایک دم افسانے لکھنے لگا تھا۔ نئے ادیب یا شاعر کو اپنے افسانے یا شعر سنانے کا مرض ہوتا ہے، ستیارتھی کو بھی تھا۔ ہو سکتا ہے کہ دوسروں کی نسبت کچھ زیادہ ہو۔ بہرحال وہ اپنے کنبے سمیت راجندر سنگھ بیدی کے ہاں مہمان ہو گئے اور صبح و شام اُسے افسانے سنانے لگے۔

بیدی اُس وقت پوسٹ آفس میں کلرک تھا اور لاہور چھاؤنی میں رہتا تھا۔ دو کمرے اُس کے پاس تھے۔ جگہ زیادہ نہیں تھی۔ پھر ستیارتھی کی موجودگی میں خلوت کا میسر آنا یوں بھی مشکل ـــــ بیدی تھکا ہارا شام کو گھر آتا تو ستیارتھی ایک افسانہ سنانے کے لیے تیار رہتے۔ سن کر نہ صرف رائے لیتے بلکہ تصحیح چاہتے۔ اسی میں رات کو دیر ہو جاتی۔ صبح اُٹھتا تو اسے تصحیح شدہ افسانہ سننا پڑتا ـــــ مہینہ بھر ستیارتھی وہاں رہے اور بیدی اپنے بیوی بچوں سے بات کرنے کو ترس گیا۔ منٹو کی کہانی "ترقی پسند" کا پلاٹ یہی ہے۔ صرف آخر میں منٹو نے ذرا افسانوی پیچ دے دیا ہے کہ ہرمارتھی ('ترقی پسند' میں ستیارتھی کا بدل) اپنے میزبان

سے کچھ ایسا چمٹتا ہے کہ اُس کے وقت کا ہر لمحہ کچھ اس طرح لے لیتا ہے کہ وہ غریب اپنی بیوی سے پیار کرنے کے لیے بھی غسل خانہ ہی بہتر جگہ خیال کرتا ہے۔

کہانی اچھی ہے۔ اس میں چٹخارہ بھی ہے لیکن منٹو نے اس سے کہیں زیادہ اچھے افسانے لکھے ہیں ـــــ مجھے کہانی پڑھنے میں دلچسپ لگی۔ لیکن چونکہ بیدی کی ذاتی زندگی کا ایک واقعہ (بیدی کے منہ سے سنا ہوا) منٹو نے قلم بند کر دیا، اس لیے مجھے برا لگا ـــــ میرے خیال میں اسے لکھنے کا حق بیدی کو تھا یا پھر منٹو کو بیدی سے کہہ دینا چاہیے تھا کہ دیکھو یار! میں اس واقعے پر افسانہ لکھ رہا ہوں، تمھیں لکھنا ہو تو میں نہ لکھوں، ورنہ میں اسے نہیں چھوڑ سکتا۔ لیکن منٹو جیسے افسانہ نگار کو اتنا صبر کہاں؟ خیال آیا تو اُسے قلم بند کر دیا۔ یہ بھی نہ سوچا کہ اس ذاتی واقعے کو لکھنے سے دو دوستوں میں شکر رنجی کی دیوار کھڑی ہو سکتی ہے۔

دوستوں کے درمیان دیوار نہ کھڑی ہوئی بلکہ انھوں نے منٹو کے خلاف ایک مشترکہ محاذ قائم کر لیا اور جس طرح منٹو نے اپنی کہانی میں بیدی اور ستیارتھی کے عادات و اطوار، شکل و شباہت اور ذاتی زندگی کا مذاق اُڑایا تھا اُسی طرح ان دونوں نے مل کر ایک افسانہ لکھا اور منٹو کی ذاتی زندگی اور خامیوں کو اُجاگر کر دیا۔ کہانی ستیارتھی کے نام سے شائع ہوئی۔ انھوں نے ہی لکھی بھی تھی۔ بیدی نے اُس پر نظر ثانی کرتے ہوئے کچھ ایسے بےپنے لگائے کہ کہانی، جہاں تک کردار نگاری کا تعلق ہے، بے حد اچھی اُتری۔ نام ہے ـــــ "نئے دیوتا"۔

"اتنی بھی کیا خوشی ہے، میں سوچ رہا تھا، اتنا تو نفاست حسن ('نئے دیوتا' میں سعادت حسن کا بدل) پہلے بھی کما لیتا ہوگا۔ ڈیڑھ سو روپے کے لیے اُس نے اپنی آزادی بیچ دی اور اب خوش ہو رہا ہے۔ وہ تو شروع ہی سے باغیانہ طبیعت کا آدمی مشہور ہے۔ اُس کے افسانے ترقی پسند ادب میں نمایاں جگہ پاتے رہے ہیں۔ پھر یہ نوکری اُس نے کیسے کر لی؟ ـــــ غریبوں پر ظلم ڈھائے جاتے ہیں، زندگی کی پتک

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

کی جاتی ہے ، سرمایہ دارانہ نظام مکڑی کی طرح برابر اپنا جالا بنتا جا رہا ہے اور غریب کسان مزدور آپ سے آپ اُس جالے میں پھنستے چلے جاتے ہیں —— ان خیالات کا مالک آج خود مکھی کی طرح اس جالے میں پھنس گیا اور اس خوشی میں یار دوستوں کو دعوت دے رہا ہے ...."

اور یوں شروع کر کے 'نئے دیوتا' کے لکھنے والوں نے لفاست حسن (یعنی سعادت حسن) کی حرکات و سکنات ، عادات و اطوار ، سفلے پن ، شراب نوشی ، چڑچڑاہٹ ، انانیت اور سنک ، پرورشن ، جنس نگاری اور دوسری کمزوریوں کا کچھ ایسے لطیف پیرائے میں مذاق اڑایا کہ منٹو بلبلا اُٹھا ۔ بعد میں ، جیسا کہ اُس کی عادت تھی ، اُس نے خود اپنی سنک اور سفلے پن کی تشہیر شروع کر دی ۔[1]

'نئے دیوتا' کے شائع ہوتے ہی لاہور اور دلی کے ادبی حلقوں میں ایک شور برپا ہو گیا ۔ چونکہ منٹو اپنے اچھے سے اچھے دوست کی عزت کسی بھی وقت اُتار کر رکھ دیتا تھا اور اپنے سامنے کبھی کسی کو کچھ نہ سمجھتا تھا اس لیے یار دوستوں کو اچھا موقع ہاتھ آیا ۔ دوست احباب ، جب اکٹھے ہوتے ، کسی نہ کسی بہانے اُس کہانی کا یا ستیارتھی کا یا بیدی کا ذکر کر کے اُسے چھیڑتے —— منٹو اس کہانی کا ذکر آتے ہی کس طرح چڑ جاتا ، دنیا جہان کا مذاق اُڑاتے ہوئے ، مذاق کیے جانے پر کس طرح سیخ پا ہو جاتا تھا ، اس کا ایک واقعہ آج بھی مجھے یاد ہے ۔

لنچ کا وقت تھا ، لوگ کھانا وغیرہ کھا کر کرشن کے کمرے میں آ اکٹھے ہوئے تھے ۔ گپ ہو رہی تھی ۔ کرشن اپنی کرسی پر سر جھکائے بیٹھا سب کی سن رہا تھا ۔ اُس کے سامنے کی کرسی پر منٹو پاؤں اوپر کیے ، گھٹنوں کو باہوں میں دبائے ، اُکڑوں بیٹھا تھا ۔ راشد ، قدوسی اور دوسرے پروگرام اسسٹنٹ منٹو کی کرسی کے گرد گھیرا بنائے ہوئے تھے ۔ (اختر الایمان

[1] - جوگیشوری کالج کے طلبہ کے سامنے تقریر کرتے ہوئے منٹو نے کہا : "البتہ جب میں بیٹھا بیٹھا اپنا لیا خریدا ہوا قیمتی پن نکالتا ہوں تو مجھے اپنا یہ سفلہ پن بہت دل چسپ معلوم ہوتا ہے ۔" (لذتِ سنگ)

اور میراجی شاید اُس وقت ریڈیو میں نہیں تھے یا شاید تھے ، مجھے یاد نہیں ۔) حفیظ جاوید نیچے دری پر ، دیوار سے پیٹھ لگائے ، گھٹنوں پر ٹانگ رکھے ، ادھ لیٹے ، ادھ بیٹھے خاموشی سے سب کچھ سن رہے تھے ۔ میں ذرا دیر سے پہنچا تھا ۔ کمرے میں جگہ نہ تھی اس لیے کونے میں پڑے ریکارڈوں کے اونچے چیسٹ پر ٹانگیں نیچے کو لٹکائے بیٹھ گیا تھا ۔ تبھی جانے کس نے اور جانے کیسے ستیارتھی کی بات چھیڑ دی اور کہا کہ نہایت گھٹیا افسانہ نگار ہے ۔

دوسرے نے کاٹا : "لیکن 'نئے دیوتا' تو اُس نے خوب کہانی لکھی ہے ۔"

"واہ !" کرشن نے سر اور دایاں ہاتھ ایک ساتھ اُٹھاتے ہوئے کہا ۔ لیکن اُسی وقت اُس کی نگاہیں منٹو سے چار ہوئیں جو ستیارتھی کا نام سنتے ہی چوکنا ہو بیٹھا تھا اور کرشن کا اُٹھا ہوا ہاتھ نیچے آ گیا اور نگاہیں پھر جھک گئیں ۔

تب کسی نے منٹو سے کہا : "ارے یار ، ستیارتھی کیا کھا کر ویسا افسانہ لکھے گا ، وہ تو بیدی کا لکھا ہوا ہے ۔"

"بیدی کا تو نہیں ۔" تیسرے نے کہا ، "لکھا تو ستیارتھی ہی کا ہے ، بیدی نے اُس میں پنے لگائے ہیں اور کہانی دو آتشہ ہو کر نکلی ہے ۔"

"ہم نے سنا فیض کا بھی ہاتھ ہے ...."

اس وقت منٹو نے پاؤں نیچے کیے ، سب کی آوازوں کو جیسے اپنی آواز کی کرختگی میں ڈبوتے اور اپنی بڑی بڑی آنکھیں جیسے گڑھوں سے نکالتے ہوئے کہا :

"بیدی اور فیض کیا اُس میں تاثیر کا ہاتھ ہے ، تبسم کا ہاتھ ہے ، ست سنگھ سیکھوں اور موہن سنگھ کا ہاتھ ہے ، منٹو از اے انسٹی ٹیوشن ...."

تب مجھے نہ جانے کیا سوجھا ، منٹو کو بات ختم کرنے کا موقع دیے بغیر میں نے کہا :

"اپنے بارے میں یار سب کو غلط فہمی ہوتی ہے ۔ وہ شیام لال کپور

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

تھا کہ "گورو گھنٹال" کا ایڈیٹر ، وہ بھی اپنے آپ کو انسٹی ٹیوشن سمجھا کرتا تھا ...."

میں نے شیام لال کا ذکر کیا تھا کہ دوستوں نے زور کا قہقہہ بلند کیا ۔ لیکن اس سے پہلے کہ میں بات پوری کرتا یا قہقہہ خاموش ہوتا منٹو جھنجھلا کر اُٹھا اور اُس نے غصے سے پاگل ہو کر دو تین غلیظ گالیوں کے ڈھیلے میری طرف پھینک دیے ۔

کوئی دوسرا موقع ہوتا ، منٹو مجھے گالی دیتا تو میں کھینچ کر ایک تھپڑ اُس کے منہ پر جا دیتا ، لیکن لڑنے کی طرح مذاق کا بھی ایک فن ہے ۔ مذاق مذاق میں جو چڑ جاتا ہے ، گالی دیتا ہے یا ہاتھ اُٹھاتا ہے دراصل وہی ہٹ جاتا ہے ۔ منٹو نے گالیاں دیں تو لوگ اور بھی زیادہ زور سے ہنس دیے ۔ کرشن نہیں ہنسا ۔ اُس نے منٹو کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا : "کیا کرتے ہو ؟" اور دوسرے لمحے منٹو نے اپنے اوپر قابو پا لیا ۔ بڑھ کر میرا ہاتھ تھاما اور دھیرے سے انگریزی میں کہا :

"ڈونٹ مائنڈ اٹ ۔"

اس وقت چاہے منٹو اور دو گالیاں بھی دے لیتا تو شاید میں ہاتھ نہ اُٹھاتا لیکن دوسری بار ، مجھے یاد ہے ، منٹو نے گالی دی اور میں ہاتھ اُٹھانے کے لیے تیار ہو گیا ۔ اگر وہ ذرا بھی منہ کھولتا تو سر پھٹول ہو جاتی ۔

فلمستان کے زمانے کی بات ہے ۔ "آٹھ دن" کی شوٹنگ چل رہی تھی اور میں نے اس میں پنڈت طوطا رام کا مزاحیہ رول لے لیا تھا ۔ چونکہ دن کو سٹوڈیو خالی نہ تھے اور اشوک کمار نے زبردستی پروڈکشن لے لی تھی اس لیے 'آٹھ دن' کی بیشتر شوٹنگ رات کو ہوتی ۔ منٹو سیٹ پر آنے کا عادی نہ تھا ۔ اُس کے اشغال دوسرے تھے ۔ لیکن جب سے میں نے تکڑم بڑھا کر 'آٹھ دن' میں رول لے لیا تھا اور منٹو کے لکھے مکالموں میں رد و بدل کرنے لگا تھا ـــــ منٹو رات کو بھی سیٹ پر آ جاتا تھا ۔ رات کو وہ پیا پلایا کرتا تھا اور سیٹ پر آنا اُسے بے حد شاق گزرتا تھا لیکن میں اُس کے مکالموں کو 'مسخ' نہ کر دوں ، اس بات کا اُسے ڈر تھا ۔

اشوک کی کہانی کے سلسلے میں میرے ساتھ اُس نے جو زیادتی کی تھی اُس سے میں بے حد چڑا ہوا تھا اور اُس کو تنگ کرنے کے درپے تھا ۔ لیکن میری یہ عادت ہے کہ لڑائی میں بھی شاذ ہی غلطی اپنے سر لیتا ہوں ۔ ہمیشہ اس بات کی کوشش کرتا ہوں کہ غلطی دوسروں کے سر رہے ۔ اس موقعے پر بھی میں نے منٹو کو اتنا چڑا دیا کہ وہ بے اختیار ہو کر گالی دے بیٹھا ، لیکن سننے والوں کو غلطی اُسی کی معلوم ہوتی ۔

'آٹھ دن' کی شوٹنگ کے بعد میں بیمار ہو کر پنچ گنی چلا گیا تھا اور میں نے وہ فلم نہیں دیکھا اس لیے مجھے اس کی کہانی یاد نہیں ۔ اتنا یاد ہے کہ رات کی شوٹنگ تھی ، شادی کا سیٹ تھا ، مجھے پنڈت کی حیثیت سے ہیرو کی شادی کرنا تھی اور میں کمر میں دھوتی کسے ، ننگے بدن پر جنیو پہنے ، رام نامی دوپٹہ گلے میں ڈالے ، سر پر پنڈتوں سی پگڑی سجائے ویدی پر بیٹھا تھا اور ہیرو کی ماں سے (یہ پارٹ لیلا مصرا کر رہی تھیں ۔) میرا جھگڑا ہو رہا تھا ۔ اس میں کہیں فقرہ آ گیا : "تو کیا میں جھک مار رہا ہوں ؟"

یا شاید یہ فقرہ تھا :

"میں ہرگز یہ جھک نہیں مار سکتا ۔"

بہرحال ، جھک مارنے کا محاورہ منٹو نے استعمال کیا تھا ۔ اشوک ہدایات دے رہے تھے ۔ منٹو بیٹھے ہوئے اور چپ چاپ ایک طرف بیٹھا سین شوٹ ہوتے دیکھ رہا تھا کہ اچانک مجھے شرارت سوجھی اور میں نے سنجیدگی سے کہا :

"میں یہ ڈائی لاگ نہیں بول سکتا ۔"

"کیوں ؟" اشوک نے پوچھا ۔

"جھک مارنا ہنسا بھرا شبد ہے ۔ ویدی پر بیٹھا ہوا ، ویدوں کا گیانی ، دھرم پران برہمن ایسا واکیہ کبھی نہیں بول سکتا ۔"

"لیکن یہ محاورہ ہے ۔" منٹو تمک کر اُٹھا ۔

"بہت سے ایسے محاورے بھی ہیں جو بڑے معنی خیز ہیں لیکن شریف لوگ نہیں بولتے ۔ اسی طرح ویدی پر بیٹھا ہوا پنڈت یہ ہنسا بھرا

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

محاورہ نہیں بول سکتا ۔" میں بولا ۔

"لیکن محاورے کا مطلب تشدد بھرا نہیں ۔"

"جھک کیا ہے ، مچھلی ۔ جھک مارنا ، مچھلی مارنا ـــــ مطلب اس محاورے کا کچھ بھی ہو لیکن کوئی پنڈت اسے نہیں بول سکتا ۔"

"بنگال کے لوگ مچھلی مارتے ہی نہیں بلکہ کھاتے بھی ہیں ۔"

"لیکن پنڈت طوطا رام بنگالی نہیں ، نہ یہ کہانی بنگالیوں کی ہے ۔"

"تم بکواس کرتے ہو ۔" منٹو جھلا اُٹھا ، "تمھیں یہ فقرہ بولنا ہوگا ۔"

"میں یہ فقرہ نہیں بول سکتا ، میں ویدی پر بیٹھا ہوا برہمن ہوں ۔"

"میں بھی برہمن ہوں ۔" منٹو گرجا ۔

"برہمن تمھارے اجداد ہوں گے ۔ اس وقت تو تم یہاں جھک مار رہے ہو" ۔

اور منٹو نے بے اختیار ہو کر زور سے مجھے گالی دی ۔

آج اپنے اس اعتراض کی بات سوچتا ہوں تو مجھے بے اختیار ہنسی آتی ہے ۔ درحقیقت دل میں مجھے اس وقت بھی ہنسی آ رہی تھی لیکن اوپر سے میں بے حد سنجیدہ بنا ہوا اس بات پر زور دے رہا تھا کہ شمالی ہند کا کوئی دھرم پرائن پنڈت ویدی پر بیٹھ کر ایسا محاورہ نہیں بول سکتا ۔ اعتراض نہایت لچر تھا لیکن جو لوگ فلمی دنیا سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ ایسے لچر اعتراض وہاں سیٹوں پر شب و روز ہوتے ہیں ۔ اعتراض کے لچر ہونے کے باوجود، برہمن اسے بول سکتا ہے یا نہیں ؟ اس سوال نے اُسے ایک دم وزن عطا کر دیا ۔ فلمی دنیا والے نہایت ڈرپوک آدمی ہوتے ہیں ۔ بڑے سے بڑا ناستک وہاں مہورت کرتا ہے ۔ (حالانکہ ان مہورتوں کے باوجود آئے دن حادثات ہوتے ہیں ، فلم فیل ہوتے ہیں اور فنانسر خسارہ اُٹھاتے ہیں ۔) میری بات اشوک اور واچا کو ٹھیک لگی ۔ منٹو نے گالی دی تو میرا پلہ اور بھی بھاری ہو گیا ۔ اور چونکہ میں محض مذاق نہ کر رہا تھا اور لڑائی پر آمادہ تھا اس لیے میں نے کہا :

"دیکھو منٹو ، میں پہلوان نہیں ہوں لیکن اتنا جانتا ہوں کہ تم بھی

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

پہلوان نہیں ہو اور تم نے اب بھی کھولے تو میں تمھیں اُٹھا کر سٹوڈیو کے باہر پھینک دوں گا ۔"

معاملے نے کچھ ایسا رخ اختیار کیا کہ اشوک گھبرا گئے ۔ شوٹنگ رک گئی ۔ اُنھیں فکر ہوئی کہ ہم دونوں اڑے رہے تو شوٹنگ نہ ہو سکے گی اور چار چھ ہزار کی ڈز پڑ جائے گی ۔ وہ منٹو کو باہر لے گئے ۔ (یا شاید مجھے لے گئے ، یہ مجھے یاد نہیں ۔) لیکن کچھ دیر بعد جب ہم سیٹ پر آئے تو منٹو نے میرے ہاتھ کو آہستہ سے دباتے ہوئے افسوس کا اظہار کیا ۔

اس کے بعد وہ پھر نہیں بیٹھا ، گھر چلا گیا ۔ پھر کبھی وہ رات کو سیٹ پر نہیں آیا ۔ میں نے مکالمے ہی نہیں مناظر تک بدل ڈالے لیکن پھر اس نے میرا راستہ نہیں کاٹا ۔

منٹو کو گالی دینے کا بہت شوق تھا ۔ اس بات کی اسے بڑی خواہش رہتی تھی کہ وہ کرشن کو ایک آدھ غلیظ گالی دے (سالے والے تو وہ کہتا ہی رہتا تھا ۔) لیکن کرشن کبھی ایسا موقع نہ آنے دیتا تھا ۔ منٹو مجھے بھی گالی دینا چاہتا تھا ۔ دو موقعوں کا تو میں نے ذکر کر دیا ۔ ایک بار اس نے مجھے گالی دی ۔ اُن دنوں ہم میں تناؤ نسبتاً کم تھا ۔ (مکرجی نے اشوک اور منٹو وغیرہ کو زک دینے کے لیے سنتوشی کو بھی بلا لیا تھا اور 'آٹھ دن' کے لیے اُس کا ایک گیت منظور کر لیا تھا ۔ مجھے اس بات کی خبر نہ تھی ، لیکن منٹو سنتوشی کا وہاں آنا پسند نہ کرتا تھا ، اس لیے وہ ایک گیت مجھ سے لکھوا رہا تھا ۔) ہم میوزک روم سے دفتر کی طرف آ رہے تھے کہ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے منٹو نے اچانک مجھے باتوں باتوں میں دھیرے سے گالی دی ۔

کسی زمانے میں میں خود بڑی گالیاں بکتا تھا ۔ والدِ محترم نت نئی گالیاں تصنیف کرنے میں یکتا تھے ۔ یوں بھی جالندھر گالی خیز خطہ ہے ۔ دوست جب ملتے ہیں تو بڑی بھاری بھرکم گالیوں سے ایک دوسرے کا خیر مقدم کرتے ہوئے ہم آغوش ہوتے ہیں ۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے میں "بھیشم" لاہور کے دفتر میں کام کرتا تھا اور اپنے سینیئر ایڈیٹر جناب

ساگر چند گورکھا کے ساتھ (جو بعد میں روزنامہ "پرتاپ" کے مزاحیہ نگار کی حیثیت سے بہت مشہور ہوئے تھے اور اب آل انڈیا ریڈیو کے کسی شعبے میں گم نامی کی زندگی بسر کر رہے ہیں ۔) ریلوے روڈ پر جا رہا تھا کہ سامنے سے میرا لڑکپن کا دوست کاونت سنگھ آتا ہوا دکھائی دیا ۔ دور ہی سے اس نے ایک موٹی سی گالی سے میرا حال چال پوچھا اور میں اس سے بھی موٹی گالی دیتا ہوا اس سے بغل گیر ہو گیا ۔ (آج یہ بات ایک خواب کی سی معلوم ہوتی ہے اور حالانکہ میری بیوی اب بھی مجھے خاصا غیر مہذب سمجھتی ہے لیکن جالندھر سے لاہور جانے والے اشک اور الہ آباد کے اشک میں زمین آسمان کا فرق ہے ۔) گورکھا صاحب حیران و ششدر کھڑے دیکھتے رہے ۔ بعد میں میں نے انھیں سمجھایا کہ وہ میرا لنگوٹیا یار تھا اور جالندھر کے لنگوٹیے یاروں میں خیرمقدم کی یہ پرانی رسم ہے ...... کاش منٹو میں اور مجھ میں ایسا یارانہ ہوتا اور ہم دونوں بے تکلفی سے ایک دوسرے کو گالی دے سکتے ـــ لیکن دفتر کی سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے اس نے دھیرے سے مجھے جو گالی دی تھی اس میں بے تکلفی نہ تھی ، یارانہ نہ تھا ، سرپرستی کا غیر مبہم سا جذبہ تھا ۔ مجھے محسوس ہوا کہ اگر میں نے یہ گالی خاموشی سے سن لی تو مجھے اور بھی گالیاں سننی پڑیں گی اور بے تکلفی نہ ہونے کے باعث میں گالی نہ دے سکوں گا ۔ میں نے فوراً کہا :

"دیکھو منٹو ، تم امرت سر کے ہو تو میں جالندھر کا ہوں ۔ میں گالیاں دوں گا تو تمھاری طبیعت صاف ہو جائے گی ـــ دوبارہ تم مجھے کبھی مت گالی دینا ۔"

اور منٹو نے مجھے پھر کبھی گالی نہ دی ۔ اس کی بے پناہ جھنجھلاہٹ میری کھال کریا کرنے کی خواہش میں ضرور ظاہر ہوتی لیکن گالی وہ مجھے نہ دے سکا ۔

منٹو جب گالی دینے پر معافی مانگ لیتا تھا ، اتنا مادہ اس میں تھا ، تو پھر کیا وجہ ہے کہ ہم میں برابر کشیدگی رہی اور ہم لڑتے رہے ؟ میں نے خود اس بات پر غور کیا ہے اور میں ہمیشہ اسی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ زندگی کی بساط پر ہمیں ایک دوسرے کے مقابل رکھ دیا گیا

اور ہم لڑنے پر مجبور رہے ۔ اگر کہیں برابر مل کے بیٹھتے بھی تو ایک دوسرے سے نبرد آزما ، ایک دوسرے کے پینترے کو کاٹ کر شہ دینے والے مہروں کی طرح ۔

ہم نے ایک دوسرے سے ملنے کی کوشش نہ کی ہو ، ایسی بات نہیں ۔ لیکن ہماری 'انا' یا احتیاط کھل کر ہمارے ملنے کے راستے کی ہمیشہ دیوار بن گئی ۔ میں نے ملنے کی کوشش کی تو منٹو تنا رہا ، منٹو نے ملنے کی کوشش کی تو میں تنا رہا ۔ ٹھیک سنہ مجھے یاد نہیں لیکن کرشن لکھنؤ جا چکا تھا ، راشد پروگرام ڈائریکٹر کی کرسی پر جا براجے تھے ، چوہڑا صاحب کو ابھی منٹو نے پہچانا نہیں تھا ۔ منٹو کو مخالفت کا حلقہ اپنے گرد تنگ ہوتا ہوا دکھائی دیتا تھا ۔ شام کا وقت تھا ، دیے جل چکے تھے اور میں میز پر بیٹھا کوئی ڈراما یا کہانی لکھ رہا تھا ۔ کوشلیا اندر باورچی خانے میں کھانا پکانے کا انتظام کر رہی تھی کہ اچانک باہر سڑک پر سے سخت اور تیکھی آواز آئی : " اشک !"

منٹو ! ـــ مجھے خیال آیا ـــ اور میرا دل دھک سے رہ گیا ۔ کیونکہ اگرچہ میں اس کے گھر (۹- حسن بلڈنگز ، کشمیری گیٹ) میں تین چار بار گیا تھا لیکن وہ گزشتہ ڈیڑھ برس میں کبھی میرے گھر نہ آیا تھا حالانکہ میں تیس ہزاری میں بھیرو کے مندر کے سامنے رہتا تھا اور ہمارے گھروں میں نصف میل سے زیادہ کا فاصلہ نہ تھا ۔ میرے ہاں تو دور رہا وہ کبھی کرشن چندر کے ہاں بھی نہ آیا تھا جو میرے نزدیک ہی رہتے تھے ۔ (میرے آنے سے پہلے آیا ہو تو میں نہیں جانتا ۔)

لیکن میں نے فوراً جواب نہ دیا ، نہ اٹھ کر دروازہ کھولا کیونکہ آواز اگرچہ منٹو کی معلوم ہوتی لیکن یقین نہ آیا کہ منٹو ہے ۔

" اشک !" وہی کرخت ، تیکھی ، قدرے چڑچڑی آواز ۔

میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا ۔ منٹو ، صفیہ بھابی اور ان کے ساتھ ایک گورا چٹا ، بڑی خوبصورت آنکھوں اور تیکھے ناک نقشے والا نوجوان ـــ تینوں اندر آئے ۔

منٹو نے تعارف کرایا :

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

" یہ مسعود پرویز ہے ۔ (میرا بھتیجا یا میرا دوست ، منٹو نے کیا کہا ، مجھے یاد نہیں ۔) تم سے ملنا چاہتا تھا ۔ میں نے کہا چلو ملا لائیں ۔"

میرے پاس اُس وقت دو چھوٹے چھوٹے کمرے ، ایک کوٹھڑی اور ایک کچن تھا ۔ منوہر لال بھارگو ، میونسپل کمشنر ، دہلی نے کمال مہربانی کر کے ہم جیسے غریب الوطنوں کے لیے بارکوں جیسے ۲۶ کوارٹر بنا رکھے تھے ۔ جس وقت کا ذکر ہے راشد ایک نمبر میں ، میں تین نمبر میں اور کرشن پانچ نمبر کے کوارٹر میں رہتے تھے ۔ ایک کمرہ سونے کا اور ایک بیٹھنے کا تھا ۔ بیٹھنے کے کمرے میں ایک طرف ایک کرسی میز کام کرنے کے لیے لگی تھی اور دوسری طرف ایک دری اور جاجم فرش پر بچھی تھی ـــــ اُسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے میں نے کہا : "بیٹھو بیٹھو" اور کوشلیا کو آواز دی کہ دیکھو منٹو اور صفیہ بھابی آئے ہیں ۔ منٹو اور پرویز بیٹھ گئے ، صفیہ بھابی اندر باورچی خانے کی طرف چلی گئیں اور میں اُس وقت تک بات چلانے کی کوشش کرتا رہا جب تک صفیہ ، کوشلیا کے ساتھ بیٹھک میں نہیں آ گئیں ۔

مجھے اس ملاقات کی کوئی بات یاد نہیں، سوا اس کے کہ مسعود پرویز کی آنکھیں بڑی خوبصورت تھیں ۔ اُس کا ناک نقشہ بے حد دل کش تھا ۔ میں نے کئی بار دزدیدہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا تھا اور میرا خیال تھا کہ وہ یقیناً فلمی دنیا میں ہیرو کی حیثیت سے مشہور ہوگا ۔ (شاید وہ اُس وقت کسی فلم کمپنی میں نوکر تھا یا جانے کی کوشش کر رہا تھا ۔) منٹو ادھر اُدھر کی بڑی اوپری باتیں کرتا رہا اور میں تنا بیٹھا رہا ۔ بات کو میں نے اپنی طرف نہیں موڑا ۔ پرویز سے یہ بھی نہیں پوچھا کہ اُس نے میری کون سی چیز پڑھی ہے ؟ وہ کب دہلی آیا ہے ؟ کیا کر رہا ہے ؟ کب تک رہے گا ؟ بات چیت کو میں نے ذاتی رخ نہیں دیا ۔ منٹو کو باتیں کرنے کے لیے چھوڑ دیا ، بلکہ جب کوشلیا آئی تو ان لوگوں کو باتوں میں مشغول چھوڑ کر میں کام کرنے کا ناٹک کرتا رہا ۔

میں نے ایسا کیوں کیا ؟ جب میں اس بارے میں سوچتا ہوں تو پاتا ہوں کہ مجھے اس بات کا ایک منٹ کو بھی یقین نہیں آیا کہ پرویز مجھ سے ملنا چاہتا تھا اور منٹو اپنی شام کے شغل سے لوشی کو چھوڑ کر

اُسے مجھ سے ملانے چلا آیا تھا ۔ صفیہ بھابی کوشلیا سے ملنا چاہتی ہوں گی ، یہ بات میری سمجھ میں آسکتی تھی ۔ صفیہ ، کوشلیا کو چاہتی تھیں اور کوشلیا بھی صفیہ اور منٹو دونوں کی عزت کرتی تھی ۔ لیکن منٹو نے اس بات کا ذکر نہیں کیا اور میرے ہاں آنے کا جو بہانہ اُس نے بنایا اُس کا مجھے یقین نہ تھا ۔ پھر منٹو کے اس طرح آنے میں ، اُس کے اُس طرح آواز دینے میں ، میرے ہاں بیٹھنے اور باتیں کرنے میں کچھ ایسا انداز تھا جیسے میرے ہاں آ کر وہ مجھ پر کوئی بڑا احسان کر رہا تھا اور مجھے اس کا شکر گزار ہونا چاہیے تھا ۔ باتوں میں اُس نے جتا بھی دیا کہ وہ اس ڈیڑھ برس میں کرشن کے گھر بھی کبھی نہیں آیا ، اور مجھے اُس کا یہ انداز کھل گیا تھا ۔

منٹو کی بات میں نہیں جانتا لیکن اس ملاقات کی بے کیفی مدتوں میرے دماغ پر حاوی رہی ۔ "میں پھکڑ آدمی ہوں ، منٹو بھی اول درجے کا پھکڑ رہا ہے لیکن ایک دوسرے کی موجودگی جانے ہماری انانیت کے کن تاروں کو چھیڑ دیتی تھی کہ وہ بے ساختہ تن جاتے تھے" ۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب میں کرسی پر بیٹھا لکھنے کا بہانہ کر رہا تھا اور پاس دری پر بیٹھے منٹو اور مسعود ، صفیہ بھابی اور کوشلیا باتیں کر رہی تھیں ، میں سوچ رہا تھا کہ میں کیوں اُن کی باتوں میں شامل نہیں ہوتا ؟ جب وہ میرے گھر آئے ہیں تو مجھے ایسا گھٹیا پن نہ کرنا چاہیے اور" چونکہ میں منٹو کے آنے کا صحیح مقصد جانتا تھا ، جسے اُس نے احساسِ برتری کے زیرِ اثر دبا رکھا تھا ، اس لیے میں کھل نہیں سکا ۔ ہلکا سا رحم کا جذبہ منٹو کو اپنی بلندیوں سے ذرا نیچے اُترتے دیکھ کر میرے دل میں ضرور پیدا ہوا ۔ لیکن اُن بلندیوں سے اُسے اُتارنے کی کامیابی پر مجھے اتنی ہی مقدار میں خوشی بھی ہوئی ۔"

منٹو پھر میرے گھر کبھی نہ آیا ـــــ دہلی میں بھی نہیں ، بمبئی میں بھی نہیں ۔ اور اُس نے دہلی چھوڑ جانا منظور کر لیا لیکن اور زیادہ نیچے اُترنا اُسے منظور نہ ہوا ۔

بمبئی میں جب ۱۹۴۵ء کے اگست میں میرے گھر لڑکا پیدا ہوا تو

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

مہینے ڈیڑھ مہینے بعد اچانک ایک دن منٹو نے سٹوڈیو میں کہا :

"صفیہ آئی ہے ۔ وہ کوشلیا سے ملنا چاہتی ہے ۔ تم ذرا اسے لے جاؤ ۔"

میں "مزدور" کے ڈائیلاگ لکھ رہا تھا اور منٹو اور مجھ میں کوئی مقابلہ نہ تھا تو بھی "مجھ سے بات کرتے وقت اُسے جھلاہٹ ہوتی تھی ۔" فلمستان کی کار آ گئی تو منٹو ، صفیہ بھابی کو اوپر سے لے آیا ۔ منٹو دفتر کے پورچ تک انہیں چھوڑنے آیا ۔ جب وہ کار میں بیٹھ گئیں تو (حالانکہ میں جانتا تھا کہ وہ نہیں جائے گا ۔) میں نے کہا : "تم بھی چلو ۔"

"نہیں ، تم جاؤ !" منٹو نے تیور چڑھاتے ہوئے کہا اور پیٹھ موڑ کر چلا گیا ۔ کار کے سٹارٹ ہونے کا بھی اُس نے انتظار نہ کیا ۔

میں نے کہا نا کہ ہمارے لیے کردار پہلے سے ڈھل گئے اور ہم اُنہیں کھیلنے کو مجبور تھے ۔ اس میں ہمارے پھکڑپنے ، انانیت اور ضد ہی کا قصور نہ تھا ، خارجی حالات بھی ایسے تھے ۔ دوستوں نے ہمیں ایک دوسرے کا حریف مان لیا تو ہماری ہر بات تو وہ اسی روشنی میں دیکھنے لگے ۔ ہمارا مطلب ایک دوسرے کو چڑانا ہو یا نہ ہو لیکن دوست ضرور ہماری باتوں کا یہ مطلب نکال لیتے ۔ مجھے ایک چھوٹا سا واقعہ یاد آتا ہے ۔ منٹو یوں کھادی کا کرتا پاجامہ پہننے کا عادی تھا لیکن ریڈیو کی زندگی میں سوٹ بھی پہنتا تھا ۔ اس نے کوئی فلمی کہانی بیچی تھی ۔ اُس کے روپے آئے تھے یا یوں ہی اُس نے ایک بڑھیا سوٹ سلوایا تھا ۔ دس یا گیارہ روپے گز کا کپڑا تھا ۔ (جو اُس زمانے میں کافی مہنگا سمجھا جاتا تھا ۔) اُنہیں دنوں کوشلیا نے نوکری چھوڑ دی ۔ تنخواہ اور سال بھر کے پراویڈنٹ فنڈ کے اُسے تین سو روپے ملے جس میں سے اُس نے میرے لیے ایک عمدہ سوٹ اور شیروانی بنوا دی ۔ میں سوٹ پہن کر دفتر میں آیا ۔ اتفاق سے میٹنگ کے وقت میں اور منٹو کرشن کے دائیں بائیں بیٹھے ۔ کرشن نے پوچھا : "کہو بھئی ، کتنے گز آیا ہے ؟" میں نے کہا : "بارہ روپے ۔" کرشن ، منٹو کی طرف دیکھتے ہوئے شرارت سے مسکرایا : "یہ تمہیں کسی میدان میں جمنے نہیں دے گا ۔" اس سے پہلے کہ منٹو کوئی جلی کٹی بات کہتا میٹنگ شروع ہو گئی ۔

کرشن چندر نے "نئے معیار" کے سلسلے میں منٹو پر لکھتے ہوئے ٹائپ رائٹروں کا ذکر کیا ہے اور اس واقعے کو اچھا خاصا افسانوی رنگ دے دیا ہے حالانکہ حقیقت اس سے مختلف ہے ۔ یہ بات غلط ہے کہ منٹو کے پاس دو ٹائپ رائٹر تھے اور میں نے تین لیے تھے ۔ بلکہ منٹو کے پاس اُردو کا ٹائپ رائٹر تھا اور میں نے اُردو ، ہندی دونوں کے ٹائپ رائٹر خریدے تھے ۔ میرا یہ اقدام کسی طرح منٹو کے مقابلے کے لیے نہیں تھا ۔ ہاں دوستوں نے اُسے وہ رنگ ضرور دیا اور میرے دو ٹائپ رائٹروں کو لے کر منٹو کو خوب چڑایا ۔

بات یہ ہے کہ میں کسی زمانے میں ہولڈر دوات سے فل سکیپ کاغذ پر افسانے لکھتا تھا ۔ چونکہ مجھے قطع و برید کا مرض ہے اس لیے کئی بار نصف صفحہ لکھ چکا ہوتا اور چند فقرے کٹ جاتے تو سارے صفحے کو پھر سے لکھنا پڑتا ۔ اس تکلیف سے بچنے کے لیے میں نے فل سکیپ کی آدھی سلپوں پر لکھنا شروع کیا کہ اگر کوئی سلپ خراب ہو جائے تو پورا فل سکیپ کاغذ دوبارہ لکھنے کے بجائے نصف لکھنا پڑے ۔ اس طرح کہانی لکھ کر میں اخبار میں دے دیتا اور ، جیسا کہ میں نے سدرشن جی کو دیکھا تھا ، اخبار یا رسالے میں چھپتے ہی اُس کی کٹنگ کاٹ کر فائل میں رکھ لیتا ۔ اس سے رسالہ خراب ہو جاتا لیکن اپنے پاس افسانے کی کاپی رکھنے کے لیے ایسا کرنا ضروری ہوتا ۔ ۱۹۳۵ء میں میں ہندی میں لکھنے لگا ۔ اُنہیں دنوں میں نے ایک غیر معروف جرنلسٹ کو دیکھا کہ وہ پنسل ربڑ لے کر بیٹھتے ، جو لفظ ، فقرہ یا تشبیہہ اچھی نہ لگتی اُسے ربڑ سے مٹا کر دوبارہ لکھتے ۔ میں Receptive آدمی ہوں ۔ جو چیز مجھے اچھی معلوم ہوتی ہے اُسے اپنا لیتا ہوں ۔ میں نے سلپوں کا طریقہ ہٹا کر یہ ربڑ اور پنسل والا طریقہ اپنا لیا ۔ پہلا مسودہ میں اس طرح اُردو میں تیار کرتا ، دوسرا ہندی میں لکھ کر کسی پرچے کو بھیج دیتا ۔ لیکن ہندی میں ترجمہ کرتے وقت میں کئی بار بڑی خوب صورت ترمیمیں کر دیتا اور جب افسانہ ہندی میں چھپ کر آ جاتا تو ان ترمیموں کو اُردو مسودے میں بھی شامل کر لیتا ۔ انہیں دنوں دو بار ایسا ہوا کہ میرے ہندی افسانے رسالے کے دفتر میں نہیں پہنچے ۔ میں اُن دنوں "وشوامتر" ، کلکتہ میں لکھا کرتا تھا ۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ رسالے والوں نے افسانے گم

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

کر دیے ہوں اور اپنی نااہلی کا الزام ڈاک کے سر تھوپ دیا ہو۔ اُردو کاپی میرے پاس تھی، لیکن اُسے پھر ہندی کرنے میں مجھے بڑی قباحت ہوئی۔ اس کے علاوہ ہندی مسودہ تیار کرتے وقت جو ترمیمیں میں نے کی تھیں وہ میں یکسر بھول گیا اور مجھے بڑی کوفت ہوئی۔ تب میں نے فیصلہ کیا کہ میں پنسل اور کاربن سے تین کاپیاں کیا کروں گا: ایک رسالے کو بھیجا کروں گا، ایک اپنی فائل میں رکھا کروں گا اور ایک فالتو اس غرض سے رکھوں گا کہ اگر کبھی کوئی افسانہ گم ہو جائے یا اسے رسالے کا ایڈیٹر واپس نہ کرے تو میں اُسے کسی دوسرے پرچے کو بھیج سکوں۔ ۱۹۳۷ء سے دہلی آنے تک میں برابر افسانوں اور ڈراموں کی تین تین کاپیاں کرتا رہا۔ کام میں ہمیشہ باقاعدگی سے کرتا ہوں، کچھ نہ کچھ لکھتا ہی رہتا ہوں، اس لیے لگاتار تین تین کاپیاں کرنے سے میرے انگوٹھے پر گٹا پڑ گیا اور اگرچہ ادھر برسوں سے میں نے پنسل سے کام نہیں کیا تو بھی وہ گٹا ابھی تک موجود ہے۔ منٹو کو اُردو میں ٹائپ کرتے دیکھ کر مجھے وہ طریقہ بہت پسند آیا اور مجھے خواہش ہوئی کہ ایک ٹائپ رائٹر میں بھی خرید لوں۔

دوسری بات یہ ہے کہ کرشن اور دوسرے دوست ٹائپ رائٹر پر ڈراما لکھا جاتا دیکھ کر بڑے متأثر اور مرعوب ہوتے تھے۔ بار بار اُس کی تعریف کرتے تھے۔ منٹو کو خود بھی اس بات کا زعم تھا کہ وہ جب چاہے، جس موضوع پر چاہے براہِ راست ٹائپ رائٹر پر کھٹا کھٹ ٹائپ کر سکتا ہے۔ عام طور پر وہ کرشن سے پوچھتا:

"بولو بھئی کرشن، کس موضوع پر ڈراما لکھا جائے؟"

لیکن کئی بار ایسا ہوتا کہ کوئی ریڈیو آرٹسٹ ہی موضوع تجویز کر دیتا۔ ایک بار غلام محمد نے کہا:

"منٹو صاحب! آپ رندھیر پر ڈراما لکھیے۔"

اور منٹو نے فوراً ٹائپ رائٹر پر انگلیاں رکھیں اور کاغذ پر الفاظ بننے لگے:

۴۸۶ - پھر عنوان —— "رندھیر پہلوان"۔ پھر:

[ڈھور ڈنگروں کے ہانکنے کی آواز —— گھنگھروؤں کی جھنجھناہٹ وغیرہ —— ان کے ساتھ یہ آواز بھی آتی ہے: اے تجھے سانپ کاٹے —— تیری ٹانگ ٹوٹ جائے .... ذیل کا گیت شروع ہو، جس کے عقب میں گائے بیلوں کے ڈکارنے اور اُن کی گھنٹیوں کی آواز آتی ہے۔]

پھر کسی نے ایک دن کہا:

"منٹو صاحب! کبوتری پر ڈراما لکھیے۔"

اور منٹو نے فوراً ٹائپ رائٹر کھٹکھٹانا شروع کر دیا:

[مرغ کی اذان —— پتھریلے زینے پر قدموں کی آواز —— پھر مرغ کی آواز —— قدموں کی آواز —— دو لڑکیوں کے گنگنانے کی آوازیں، جیسے وہ زیرِ لب پوجن کر رہی ہیں —— یہ گنگناہٹ چند لمحوں تک جاری رہے —— اس کے بعد آرتی شروع —— آرتی ختم ہو جاتی ہے —— وقفہ —— گھنٹہ ایک بار بجتا ہے —— وقفہ —— دوسری بار بجتا ہے —— پتھریلے زینے پر قدموں کی آواز —— یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ دونوں لڑکیاں مندر سے باہر نکل رہی ہیں۔]

یہ لمبے ڈیش اور وقفے، جو منٹو کے تمام ریڈیائی ڈراموں میں بکثرت موجود ہیں، اس بات کے شاہد ہیں کہ وہ ساتھ ساتھ سوچتا رہتا تھا۔ بہرحال ایک بار شروع کر کے، ایک آدھ پیرا ٹائپ کرنے کے بعد، وہ سگریٹ سلگا لیتا۔ کچھ لمحوں کے لیے پاؤں اوپر کر کے کرسی پر بیٹھ جاتا اور پھر لکھنا شروع کر دیتا۔ ایک بار منٹو نے مجھے بھی یہ گر بتایا تھا کہ کچھ نہ سوجھے تو کوئی شعر یا گیت لکھ دو، اتنے میں اگلے ڈائیلاگ سوچ لو اور کچھ نہ ہو تو نثر میں شاعری شروع کر دو۔

لیکن آل انڈیا ریڈیو دہلی میں ملازم ہونے سے پیشتر میں اپنے چند کامیاب ڈرامے جیسے —— "لکشمی کا سواگت"، "حقوق کا محافظ"، "پاپی"، "سمجھوتہ"، "چھنا بیٹا" وغیرہ لکھ چکا تھا اور ڈرامے کے بارے میں میرا

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

یہ خیال ہے کہ ڈراما وہی اچھا ہے جو کھیلا جا سکے ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ریڈیائی ڈرامے کے امکانات بہت زیادہ ہیں اور اُس کے سننے والوں کی تعداد اس وقت بھی سٹیج کا ناٹک دیکھنے والوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے ۔ دس برس پہلے تو یہ بُعد اور بھی گہرا تھا ، کیونکہ اب تو آزادی کے بعد لوگ سٹیج کانشس (Stage Conscious) ہوتے جا رہے ہیں اور سکولوں ، کالجوں اور ایمیچر سٹیج پر ناٹک دھڑادھڑ کھیلے جا رہے ہیں ۔ اُس وقت شاذ ہی کبھی ناٹک کھیلا جاتا تھا ۔ کبھی ہوتا بھی تھا تو کسی انگریزی ناٹک کا ترجمہ ۔ لیکن چونکہ مجھے لڑکپن ہی سے سٹیج کے ساتھ دل بستگی تھی اس لیے میں اس کے احیاء کے لیے شروع سے کوشاں تھا اور میری یہ کوشش تھی کہ میں ایسے ڈرامے لکھوں جو آسانی سے کم خرچ پر کھیلے جا سکیں اور جب کوئی ایمیچر کلب یا سکول ڈراما کھیلنا چاہے تو انگریزی سے ترجمہ کرنے کے بجائے اُسے ہندوستانی ڈراما مل سکے ۔ میرا یہ خیال کتنا صحیح تھا ، اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ آج میرے ناٹک کشمیر سے ترویندرم اور پنجاب سے بنگال تک کھیلے جاتے ہیں ، پڑھے جاتے ہیں ، پڑھائے جاتے ہیں اور میرے ڈراموں کے مجموعے افسانوں یا ناولوں سے زیادہ بکتے ہیں ۔

منٹو کے ریڈیائی ڈراموں کا مجھ پر کچھ ایسی رعب نہیں پڑا ۔ یہ ٹھیک ہے کہ جہاں تک ریڈیائی ڈرامے کا تعلق ہے منٹو نے تکنیک کے نئے اور کامیاب تجربے کیے اور ریڈیو تکنیک کے امکانات کا پورا پورا فائدہ اُٹھایا ، لیکن منٹو کے کچھ ڈرامے دیکھنے اور سننے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ سٹیج ناٹک کو تھوڑی سی ترمیم کے بعد ریڈیو ناٹک میں تبدیل کیا جا سکتا ہے اور وہ وقت ، جگہ اور ایکشن کے ایجاز کی وجہ سے ریڈیو سننے والوں کے لیے محض ریڈیائی ناٹکوں کے مقابلے میں اگر زیادہ نہیں تو کم دل چسپ بھی ثابت نہ ہوگا ۔ اس طرح ہم دونوں کے ناٹکوں کی تکنیک مختلف تھی ۔ کرشن ، منٹو کے ڈراموں کا قائل تھا لیکن انصار ناصری کو میرے اور بیدی کے ناٹک پسند تھے ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس دور میں منٹو نے اور میں نے چند بہت اچھے ناٹک لکھے ۔ "چرواہے" اور "ازلی راستے" کے بیشتر ڈرامے اُسی دور میں لکھے گئے ۔

منٹو کے ڈراموں سے میں مرعوب نہیں ہوا ، لیکن یہ خواہش ضرور

ہوئی کہ ایک دو ناٹک براہِ راست ٹائپ رائٹر پر لکھوں اور کرشن کو دکھلا دوں کہ نہ اس طرح کے ریڈیائی فیچر لکھنا مشکل ہیں نہ انھیں براہِ راست ٹائپ کرنا ۔ اور میں نے ایک دن منٹو کے سامنے ٹائپ رائٹر خریدنے کا ذکر کیا ۔ منٹو نے اپنا ٹائپ رائٹر قسطوں پر خریدا تھا ۔ شاید ایجنٹ اُس کا واقف تھا ۔ یوں منٹو کا گھر رمنگٹن رینڈ کمپنی ، کشمیری گیٹ کے نزدیک ہی تھا ۔ ایک دن ایجنٹ دفتر میں آیا ۔ میں نے کانٹریکٹ بھر دیا ۔ وہ کانٹریکٹ اب بھی میرے پاس موجود ہے اور اُس پر گواہ کے طور پر منٹو کے دستخط ہیں ۔ منٹو یہ چاہتا تھا کہ میں بھی اُسی کی طرح قسطوں پر ٹائپ رائٹر لے لوں ۔ میں نے کانٹریکٹ کیا بھی ، لیکن قسطوں پر لینے میں ۲۲۳ روپے کے ٹائپ رائٹر کے تین ، سوا تین سو روپے مجھے دینے پڑتے ۔ یہ ٹھیک ہے کہ سال ڈیڑھ سال کا عرصہ اور چھوٹی قسط تھی ، لیکن مجھے اتنی تھوڑی رقم کا ۷۵ روپے سود بہت زیادہ معلوم ہوا ۔ اس لیے جب ایجنٹ پہلی قسط لینے آیا تو میں نے اُسے سارے کا سارا روپیہ دے دیا اور یوں دوستوں کے دل میں اپنے لیے نفرت کا ایک اور جواز پیدا کر لیا ۔ منٹو ہو ، کرشن ہو یا راشد ـــــ تینوں پیسہ جوڑنے کے سخت خلاف تھے ۔ جو آیا اُڑا دیا ، بلکہ اگر قرض مل گیا تو اُس میں بھی کچھ مضائقہ نہیں ۔ میں ڈھائی سو روپے ٹائپ رائٹر کے لیے یک مشت دے سکتا ہوں ، جب کہ وہ قسطوں پر مل جاتا ہے ، یہ بات منٹو کو اچھی نہ لگی ۔ پیسہ دراصل میں بھی نہ جوڑتا تھا ، لیکن پہلی بیوی کی وفات کے بعد ساٹھ روپے کی حقیر رقم کے لیے (جو میں نے ایک عزیز سے اُدھار لی تھی ۔) مجھے خاصا ذلیل ہونا پڑا تھا اور میں نے طے کیا تھا کہ میں کبھی کسی سے اُدھار نہ لوں گا اور جس طرح بھی ہو کچھ نہ کچھ پس انداز کروں گا ۔ جب میں نے ریڈیو کی ملازمت کی تو میرے پاس ڈیڑھ ہزار روپے تھے ۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جس طرح ٹائپ رائٹر پر منٹو کے ڈرامے لکھنے کو لے کر دوست مجھے چڑایا کرتے تھے اسی طرح میرے یک مشت روپیہ دے دینے پر اُنھوں نے منٹو کو چڑایا ۔ اور جب ایک آدھ ماہ ٹائپ رائٹر پر پریکٹس کرنے کے بعد (مجھے زیادہ دقت پیش نہیں آئی کیونکہ انگریزی ٹائپ کرنا مجھے آتا تھا ۔) میں نے براہِ راست ٹائپ رائٹر پر ایک فیچر تیار کر کے کرشن کو دیا تو دوستوں نے منٹو سے کہا :

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"لو بھئی منٹو، تمھارا اجارا ختم ہوا۔"

لیکن چونکہ اُس وقت تک میں اُردو میں بھی برابر لکھتا تھا اور ڈرامے ہندی رسم الخط میں کم اور اُردو میں زیادہ لکھتا تھا اس لیے میں نے کئی دوستوں سے کہہ رکھا تھا کہ ریمنگٹن کے پاس تو اس وقت اُردو کا ٹائپ رائٹر نہیں ہے لیکن اگر کسی دوست کے پاس اُردو ٹائپ رائٹر برائے فروخت ہو تو مجھے پتا دیں۔ اُن دوستوں میں ایک جرنلسٹ دوست بھی تھے جو آج آل انڈیا ریڈیو کے بڑے عہدے پر فائز ہیں لیکن اُس وقت ایک فلم ڈسٹری بیوٹر کے ہاں پبلسٹی افسر تھے۔ اُن کے کسی دوست کے پاس ایک ٹائپ رائٹر تھا۔ انھوں نے منٹو سے کہا کہ بھئی اشک کو ضرورت ہے، ایک سو دس روپے میں یہ دینے کو تیار ہیں، تم اشک کو لے دو۔ اُن صاحب نے شوق میں ٹائپ رائٹر لے لیا تھا لیکن اُسے استعمال نہ کر سکے تھے اور اُس میں زنگ لگ گیا تھا ـــــ منٹو ٹائپ رائٹر کو گھر لے گیا۔ وہ مشین کو کھولنا اور صاف کرنا جانتا تھا۔ اُس نے اُس مشین کو بھی اچھی طرح صاف کیا۔ پٹرول کی پوری بوتل اُس میں صرف کر دی اور دوسرے دن مجھے لا کر مشین دکھائی کہ اس کے ایک دوست کی ہے، بالکل چلی نہیں، تم چاہو تو خرید لو۔

میں نے مشین کو چلا کر دیکھا تو مجھے وہ بہت پسند آئی۔ میری ہندی والی مشین نئی ہونے کے باوجود بہت بھاری تھی اور یہ اُردو والی مشین پرانی تھی لیکن بڑی رواں تھی۔ میں نے منٹو سے دام پوچھے۔ اُس نے کہا:

"میرے دوست نے تو تین سو میں خریدی تھی لیکن وہ ڈیڑھ سو میں دے دے گا۔"

میں نے چپراسی کے ہاتھ چیک بک منگائی، لیکن جب میں چیک کاٹنے لگا تو منٹو نے کہا:

"تم ابھی ایک سو دس روپے کا چیک کاٹ دو، چالیس روپے نقد اگلے ماہ دے دینا۔"

مجھے یہ بات عجیب تو معلوم ہوئی لیکن میں نے اُس وقت ایک سو

دس روپے کا ایک چیک کاٹ دیا اور دوسرے مہینے تنخواہ کے دن منٹو کو چالیس روپے نقد دے دیے۔

کئی ماہ بعد اچانک وہ جرنلسٹ دوست مجھ سے دفتر میں ملنے آئے۔ میں نے اُردو مشین کا کوئی ذکر نہ کیا چنانچہ انھوں نے خود ہی کہا:

"بھئی وہ مشین ایک سو دس روپے میں میں نے بھجوائی تھی۔"

"کون سی مشین؟"

"اُردو مشین، جو تم نے مانگی تھی۔"

"لیکن وہ تو منٹو نے اپنے دوست سے خرید کر دی تھی۔"

"میرے دوست کے پاس تھی۔ وہ تو ڈیڑھ سو مانگ رہا تھا لیکن میں نے ایک سو دس میں فیصلہ کر دیا تھا۔"

"مگر منٹو نے تو مجھ سے ڈیڑھ سو روپے لیے۔"

دوست کو بڑا افسوس ہوا۔ انھوں نے کہا:

"میں باہر جا رہا تھا اور منٹو سے کہہ گیا تھا کہ اشک نے ایک بار مشین کا ذکر کیا تھا، یہ اُسے دلا دو، اور بات ایک سو دس کی ہوئی تھی۔"

اُن کے جانے کے بعد میں نیچے گیا تو میں نے منٹو سے کہا:

"تم نے مجھ سے ٹھیک بات کیوں نہیں کہی۔ چالیس روپے کے لیے جھوٹ کیوں بولا؟"

"میں نے کہا یہ اشک سب سے سودا کرتا ہے، ہم بھی اُس سے ایک سودا کر لیں۔"

منٹو نے آنکھیں نکال کر کہا، لیکن اُس کے چہرے پر اچانک آ جانے والے کھسیانے پن کو اس کی آنکھیں نہ چھپا سکیں!

"یہ تم نے اُس وقت کیوں نہ کہا؟" میں بولا، "اگر تم کہتے، دیکھو بھائی، یہ مشین خواہ میں نے مفت لی ہو لیکن تمھیں اس کے

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

ڈیڑھ سو روپے دنے ہوں گے تو میں اُس صورت میں بھی مشین لے لیتا۔ لیکن تم چالیس روپے کے لیے جھوٹ بولے ، اس کا مجھے رنج ہے۔"

چونکہ اُس وقت تک منٹو سے میرے تعلقات کافی بگڑ چکے تھے اس لیے اس سے زیادہ بات نہ ہوئی۔

بہرحال ، اُردو کا ٹائپ رائٹر آ گیا تو میں دونوں ٹائپ رائٹر لے کر دفتر آنے لگا اور دوست منٹو کو چڑانے لگے۔ مجھے ایک شام یاد ہے۔ ہم دونوں دفتر سے ایک ساتھ نکلے۔ منٹو کے دائیں ہاتھ میں ٹائپ رائٹر اور بائیں ہاتھ میں نفیس چمڑے کا بیگ تھا۔ میرے دونوں ہاتھوں میں ٹائپ رائٹر تھے۔ (ہم لوگ ایکسچینج بلڈنگ تک پیدل آتے تھے اور وہاں سے تانگہ لیتے تھے۔) اُس شام کو دوستوں نے منٹو کو اتنا چڑایا کہ وہ جھلا کر بولا :

"میں یہ ٹائپ رائٹر سالا بیچ دوں گا اور پن سے لکھا کروں گا۔"

لیکن منٹو نے ڈراما کبھی پن سے نہیں لکھا اور نہ اپنا اُردو کا ٹائپ رائٹر فروخت کیا حالانکہ "نئے ادب کے معمار" کے سلسلے میں کرشن چندر نے ایسا لکھا ہے۔ منٹو جب تک دہلی کے ریڈیو سٹیشن پر رہا ڈراما ہمیشہ ٹائپ کرتا رہا۔ جب میں اُس کی دعوت پر بمبئی گیا اور اُسی کے گھر ٹھہرا اُس وقت بھی ٹائپ رائٹر اُس کے پاس تھا حالانکہ منٹو نے اُسے برس بھر سے استعمال نہ کیا تھا۔ فلمستان کے سٹوڈیو میں میں نے کبھی اُسے ٹائپ رائٹر لاتے نہیں دیکھا۔" بات یہ ہے کہ ریڈیو سٹیشن پر منٹو ہفتے میں ایک ڈراما دیتا تھا۔ خاصی جلدی میں اُسے ڈرامے لکھنے پڑتے تھے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اتنی جلدی ڈراما لکھنا ہو ، اس میں سٹیج کی ضروریات کو ملحوظ نہ رکھنا ہو تو ٹائپ رائٹر سے بہتر کوئی دوسری چیز نہیں۔" بمبئی میں ایسی کوئی جلدی نہ تھی۔ ہفتے میں ایک آدھ سین ہوتا تھا اور اُس کے لیے اس میل سے ٹائپ رائٹر اُٹھائے لانا بالکل بے معنی تھا۔

"ٹائپ رائٹروں کی یاد آتے ہی کینوس لیدر کے بڑے سے سفید ٹکڑے

اور برش کی یاد آتی ہے جو منٹو ہمیشہ اپنے ٹائپ رائٹر کے اندر رکھتا تھا۔ صبح آتے ہی میٹنگ کے بعد وہ جب اپنی میز پر کیس سے ٹائپ رائٹر نکال کر رکھتا تو پہلے برش سے ٹائپ کے حروف صاف کرتا ، پھر لیدر کے اس ٹکڑے سے اُسے صاف کر کے چمکا دیتا اور پھر اپنے چمڑے کے خوب صورت بیگ سے کاغذوں کی فائل نکالتا اور ڈراما ٹائپ کرنے بیٹھتا۔ منٹو میں سعادت تھی یا نہیں؟ یہ میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا ، لیکن نفاست ضرور تھی اور اس لحاظ سے ستیارتھی نے اپنی کہانی "نئے دیوتا" میں اُس کا نام نفاست حسن ٹھیک ہی رکھا تھا۔" منٹو گندے غلیظ ہوٹلوں یا ریستورانوں میں شراب پی لیتا تھا ، میں نے خود اُسے دو بار خاصے گندے ہوٹلوں میں شراب پیتے دیکھا ، لیکن" اُس کے گھر کی ہر چیز میں اُس کی نفاست پسندی عیاں تھی۔ اُس کی بیوی باہر گئی ہو تو اُسے خود گھر کی صفائی کرنے میں عار نہ ہوتا۔ جس صبر سے وہ اپنی مشین صاف کرتا تھا اُسی طرح ، وقت پڑنے پر ، اپنا گھر بھی خود ہی صاف کر لیتا تھا۔ ایک بار میں دہلی کی ملازمت کے اوائل میں کرشن چندر کے ساتھ اُس کے گھر ، نمبر ۹۔ حسن بلڈنگز ، نکلسن روڈ ، دہلی ، گیا تو اُسے ہاتھ میں جھاڑو لیے ہوئے کمرے صاف کرتے پایا — کھادی کا کرتا پاجامہ دھول سے قدرے میلا ہو گیا تھا۔ وہ اپنے فلیٹ کے چھوٹے کمرے کو صاف کر کے مٹی دہلیز کے باہر نکال رہا تھا۔" غالباً کچھ تھک بھی گیا تھا۔ اپنی بڑی بڑی آنکھیں گدھوں سے ایک دم باہر نکالتے ہوئے اُس نے ہماری طرف دیکھا اور اشارہ کیا کہ بیٹھک میں چلو۔ اُس کی وہ باہر کو نکلی ہوئی آنکھوں میں نہ جانے کیا تھا کہ میں آج تک اُن کی یاد فراموش نہ کر سکا۔

حسن بلڈنگز میں دو منزلیں ہیں اور پندرہ بیس ایک جیسے فلیٹ ہیں۔ پہلی منزل میں آنگن آدھا چھتا اور کشادہ ہے ، اوپر کی منزل میں آنگن اُتنا ہی ہے جتنا نیچے چھتا ہوا۔ منٹو پہلی منزل میں رہتا تھا۔ دو بڑے اور ایک چھوٹا کمرہ۔ کچن الگ۔ منٹو نے ایک ڈرائنگ روم بنا رکھا تھا ، ایک سونے کا کمرہ۔ چھوٹا کمرہ غالباً سامان کا تھا۔ کھانے کی میز باہر چھت کے نیچے ایک طرف لگی رہتی تھی۔

ہاتھ منہ دھو کر اور کپڑے بدل کر منٹو آ گیا۔ کرشن کو شاید

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

نئے ڈرامے کا مسودہ درکار تھا ۔ منٹو نے ایک دراز سے بڑی خوب صورت فائلیں نکالیں جن میں پیتل کے چمچاتے پیپر کلپ لگے تھے ۔ دراصل ریڈیو سے جو فائلیں ملتی تھیں منٹو انھیں درمیان سے کاٹ کر اُن کے دونوں صفحے الگ الگ کر لیتا تھا ، پھر مسودہ دونوں صفحوں میں رکھ کر فائل میں دائیں طرف اوپر ، درمیان میں اور نیچے پیتل کے تین پیپر کلپ لگا لیتا تھا ۔ ہر ناٹک اُس نے اسی طرح سنوار کر پیلی ، نیلی یا گلابی فائل میں لگا رکھا تھا ۔ میں منٹو کی کسی اور چیز سے مرعوب ہوا یا نہیں لیکن اس نفاست پسندی اور باقاعدگی سے ضرور متأثر ہوا ــــ اپنے مسودوں کو اس کا یوں سنبھال کر رکھنا مجھے بہت بھایا اور گھر آ کر سب سے پہلا کام میں نے یہ کیا کہ بازار گیا ، ڈھونڈ ڈھانڈ کر کہیں سے سو پیپر کلپ لایا اور دفتر کی فائلوں کو دو حصوں میں منقسم کر کے اوپر کے صفحے پر ٹائپ رائٹر سے کہانی یا ناٹک کا نام لکھ کر منٹو ہی کی طرح میں نے اپنے مسودے پیتل کے چمکتے ہوئے پیپر کلپوں سے باندھ دیے ۔ اس طرح نہ صرف کاربن اور پنسل سے لکھ کر تین تین کاپیاں کرنے سے نجات ملی بلکہ رسالے کو پھاڑ کر افسانے کی کاپی رکھنے اور یوں کتاب مرتب کرنے کی کوفت سے مُکتی پائی ۔

منٹو نے اپنی کہانی کا کیا معاوضہ لیا ؟ اپنی کتابوں کی کیا رائلٹی لی ؟ اس کا مجھے کچھ زیادہ علم نہیں ۔ ضرورت پڑنے پر وہ جو بھی مل جائے لے کر افسانہ ، ڈراما یا اُن کے مجموعے ناشر کو دے سکتا تھا ۔ جہاں تک میرا خیال ہے اُس نے اپنے بیس اکیس افسانوں کے پہلے مجموعے کا دائمی حقِ اشاعت دو تین سو روپے میں ناشر کو دے دیا تھا ۔ لیکن ایک بات یقینی ہے کہ بغیر کچھ معاوضہ لیے وہ افسانہ دینے کے خلاف تھا ۔ اس کے برعکس کرشن نے کبھی اس بات کی پرواہ نہیں کی ۔ اب کی بات میں نہیں جانتا ، اُس وقت وہ بغیر پہلے کچھ لیے افسانہ دے دیتا تھا ۔ (ایک افسانے کی بات دور رہی ، اس نے اپنے افسانوں کا پہلا مجموعہ "طلسمِ خیال" بغیر کچھ پیشگی لیے دے دیا تھا ۔) اور چونکہ وہ اپنے افسانے کے لیے معاوضہ نہ لیتا تھا اس لیے رسالوں کے ایڈیٹر اُس کی تعریف میں نوٹ چھاپتے تھے ، اُس کی تصویریں شائع کرتے تھے ۔ کرشن کا معاوضہ لینے کا طریقہ مختلف تھا ۔ وہ چیز دیتے وقت کچھ نہ طلب کرتا ، البتہ بعد

میں کسی نہ کسی اشد ضرورت کے پیشِ نظر کچھ نہ کچھ لے لیتا تھا ۔ اس طرح ایڈیٹر کو اپنے اوپر احسان کرنے کا موقع دے دیتا تھا ۔ میرا طریقہ دونوں سے مختلف تھا ۔ میں نے آج تک کبھی افسانہ مفت نہیں دیا ۔ کبھی اس بات کی پرواہ نہیں کی کہ افسانہ شروع میں چھپتا ہے یا آخر میں ۔ ۔۔۔ حتی الامکان میں نے اس کی پوری قیمت وصول کی ۔ ظاہر ہے کہ چودھری نذیر ہوں ، مولانا صلاح الدین یا شاہد صاحب ، کوئی مجھ سے خوش نہیں رہا ــــ بہرحال منٹو میں اور مجھ میں ایک بات مشترک تھی ــــ وہ بھی افسانہ دیتے وقت معاوضہ (کم یا زیادہ) چاہتا تھا اور میں بھی ۔ اسی سلسلے میں دہلی کا ایک دل چسپ واقعہ مجھے یاد ہے ۔ دہلی میں ایک صاحب تھے آغا سرخوش ۔ اپنے مرحوم والد کی یاد میں ، جو مشہور شاعر تھے ، ایک رسالہ نکالتے تھے ۔ نام بھول رہا ہوں ، شاید "چمنستان" ۔ اُن کی چھوٹی بہن ریڈیو میں کبھی کبھی ڈراموں میں کام کیا کرتی تھی اور بعد میں مستقل آرٹسٹ ہو گئی تھی ۔ نام بھلا سا تھا ، حجاب یا سحاب قزلباش ۔ سرخوش صاحب نے 'چمنستان' میں کرشن کی افسانہ نگاری پر کوئی مضمون شائع کیا تھا ۔ کرشن کے افسانے بھی شائع کیے تھے ۔ ایک مجموعہ بھی شائع کیا تھا ۔ اور جب کرشن دہلی سے چلے گئے تو کرشن کے خلاف (کرشن نے راشد کی "ماوراء" پر جو دیباچہ لکھا تھا ، اُس میں کسی مغربی شاعر کے تنقیدی مضمون سے لفظ بہ لفظ پیرے چرا لیے تھے ، اس سلسلے میں) ایک مضمون بھی شائع کیا تھا ۔ بہرحال ، آغا سرخوش صاحب ایک دن دفتر میں آئے ۔ پست قد کے نوجوان ، اور مفت خورے ایڈیٹروں کی بات چیت میں جو مسکینی اور جھجھک ہوتی ہے وہ اُن کے ہاں بھی تھی ۔ میں اوپر کمرے میں بیٹھا تھا ۔ انگریزی پروگراموں کے انچارج مسٹر لوپی کلارک حالانکہ پرلے درجے کے بیکڑ آدمی تھے لیکن تھے وہ انگریز اور انگریز کا دبدبہ تھا ۔ سرخوش جھجھکتے جھجھکتے اجازت لے کر اندر آئے اور انھوں نے اپنا تعارف کرایا ۔ میں اُن کو جانتا تھا ۔ کرشن کے کمرے میں چوروں کی طرح آنے اور اُن کے کان میں کچھ کھسر پھسر کرتے ہوئے میں نے انھیں دیکھا تھا ۔ بہرحال میں نے کرسی پیش کی ۔ وہ بیٹھے نہیں ، کھڑے کھڑے ہی انھوں نے کہا کہ دہلی کے مشہور شاعر اور اپنے بزرگوار کی یاد میں وہ 'چمنستان' کا آغا شاعر قزلباش نمبر

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

نکالنے جا رہے ہیں ۔ کرشن نے ایک افسانہ دینے کا وعدہ کیا ہے ۔ میں بھی ایک افسانہ انھیں عنایت کروں ۔

میں نے عرض کیا کہ میں تو بغیر پیشگی معاوضہ لیے افسانہ دیتا نہیں ، لیکن چونکہ آپ بڑے کارِ خیر کے سلسلے میں نمبر نکال رہے ہیں اس لیے اگر منٹو بھی اُس میں افسانہ دینے کو تیار ہو تو میں بھی دے دوں گا ۔ کرشن تو کبھی پیسے لیتا نہیں اس لیے اُس کے افسانہ دینے کی سند نہیں ۔

سرخوش صاحب نے کہا :

"میں نے منٹو صاحب سے پوچھا نہیں ، لیکن میں اُن سے ضرور ملوں گا اور مجھے پورا یقین ہے کہ وہ اپنا افسانہ مرحمت فرما دیں گے ۔"

"ٹھیک !" میں نے کہا ، "وہ مرحمت فرمائیں گے تو میں بھی فرما دوں گا ۔"

آغا سرخوش کیا کہتے ؟ چپ چاپ آداب کرتے ہوئے چلے گئے ۔ وہ ایک طرف سے گئے میں دوسری طرف سے نیچے پہنچا ۔ میوزک روم میں اس سے اُس سے باتیں کرتا اس بات کی تاک میں رہا کہ کب وہ منٹو کے کمرے میں جاتے ہیں لیکن وہ کرشن کے کمرے میں ایسے داخل ہوئے کہ نکلنے ہی میں نہ آئے ۔ تب میں منٹو کے کمرے میں گیا ۔ وہ کوئی ڈراما ٹائپ کر رہا تھا ۔ مجھے آتے دیکھ کر اُس نے سر اُٹھایا ۔

"آغا سرخوش نہیں آئے ؟"

"سرخوش؟"

"چمنستان" کے ایڈیٹر ، آغا شاعر قزلباش کے فرزندِ ارجمند ! کرشن عموماً اُن کے رسالے کے لیے کہانیاں لکھا کرتا ہے لیکن اس بار وہ اپنے والدِ بزرگوار کی یاد میں رسالے کا خاص نمبر نکال رہے ہیں ۔ میرے پاس افسانے کے لیے آئے تھے ۔ میں تو بغیر معاوضہ لیے افسانہ دیتا نہیں ، سو میں نے کہا کہ تم دو تو میں بھی دے دوں گا ۔"

میں نے ابھی بات ختم نہ کی تھی کہ آغا صاحب جھجکتے ہوئے داخل ہوئے اور انھوں نے اپنے آنے کی غرض و غایت بیان کی ۔

"کتنے روپے دیں گے ؟" منٹو نے کہا ، "افسانہ آج ہی لکھ دوں گا ۔"

اس پر آغا صاحب نے کھیسیں نکال دیں :

"یہ نمبر تو ، منٹو صاحب ، میں نے اپنے مرحوم والد صاحب کی یاد میں نکالنے کا فیصلہ کیا ہے ۔ وہ دہلی کے مشہور شاعر ...."

لیکن منٹو نے انھیں بات ختم نہیں کرنے دی :

"صاحب ، آپ اپنے والد کی یاد میں نمبر نکال رہے ہیں ، مجھے بھی کچھ پیسے چاہییں کہ میں اپنے والد کی قبر پر کچھ پھول چڑھاؤں اور نمبر نہیں نکال سکتا تو ایک آدھ پھل دار درخت ہی لگاؤں ۔"

اور منٹو نے کچھ اس طرح آنکھیں نکال کر اُن کی طرف دیکھا کہ وہ لحظہ بھر کو بھی وہاں نہیں رکے ۔

میں اگرچہ اُن کے ساتھ ہی باہر آیا لیکن پھر اُنھیں مجھ سے افسانہ مانگنے کا حوصلہ نہیں ہوا ۔

میں اور منٹو ہمیشہ لڑتے ہی نہیں رہے ، ہمیں ایک دوسرے کے قریب آنے کا بھی موقع ملا ۔ دہلی میں تو خیر پہلی ہی بات ٹھیک ہے لیکن بمبئی میں ، جب منٹو نے مجھے فلمستان میں مکالمہ نویس کی حیثیت سے بلایا ، تو میں آٹھ دس دن اُسی کے ہاں رہا اور بعد میں جب میں نے اس بات کا انتظام کر لیا کہ منٹو اور میں ایک یونٹ میں کام نہ کریں ، ہم دونوں کئی بار اکٹھے بھی بیٹھے ، اکٹھے ہم نے مکرجی کو شعر اور لطیفے سنائے ، راجہ مہدی علی خاں کی غزلیں سنیں — اور اگرچہ میں نے تو منٹو کو کبھی اپنی کوئی چیز نہیں سنائی لیکن میں نے اُس کی دو تین کہانیاں اُس کے منہ سے سنیں اور "سوراج کے لیے" تو اُس نے میرے سامنے ہی لکھی ۔ نصف لکھ کر منٹو نے اُسے چھوڑ دیا اور پھر جب دو تین ماہ بعد اُسے ختم کیا تو اُس نے ساری کہانی مجھے نئے سرے سے سنائی ۔

منٹو کلیر روڈ پر رہتا تھا ۔ دوسرے مالے پر اُس کا فلیٹ تھا ۔ مکان پرانی طرز کا تھا اس لیے اُس میں کیڈل روڈ یا چوپاٹی یا میرین لائنز جیسے فلیٹ نہ تھے ۔ ایک کافی بڑا کمرہ تھا جو ڈرائنگ روم اور ڈائننگ روم کا کام دیتا تھا ۔ ایک دوسرا قدرے چھوٹا کمرہ تھا جس میں ایک پارٹیشن

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

تھی ۔ اُس کے اس طرف پلنگ بچھا ہوا تھا اور دوسری طرف باورچی خانہ تھا ۔ چولہے پر تو بمبئی میں بہت کم کھانا پکتا ہے ، لکڑی کی انگیٹھی پر سب کام ہوتا ہے ۔

سونے کے کمرے میں سجاوٹ کی اتنی گنجائش نہ تھی حالانکہ پلنگ اور ڈریسنگ ٹیبل خوبصورت تھی ، لیکن باہر کا بڑا کمرہ صوفہ سیٹ ، میز اور کرسیوں سے خوب سجا ہوا تھا ۔ اُدھر کے کونے میں چھوٹی سی کھانے کی میز تھی جس کے اردگرد چار یا چھ کرسیاں تھیں ۔ اس کے ایک کونے میں الماری تھی جس میں منٹو کے کپڑے اور جوتے تھے ۔ دائیں طرف دیوار کے ساتھ میز تھی جس پر ہر چیز قرینے سے سجی تھی ۔

منٹو مجھے سٹیشن پر لینے آیا تھا ۔ بمبئی سنٹرل پر فرنٹیر میل رکی ۔ منٹو سیکنڈ کلاس کے آگے ہی کھڑا تھا ۔ اُترتے ہی نے اُس مجھے بغل میں لے لیا ۔ کوشلیا کو چونکہ 'ایڈمرل ہاؤس' جانا تھا اس لیے اُس نے وہاں فون کر کے ایک پک اپ منگوانے کے لیے کہا ۔ یہ جان کر منٹو کو کچھ جھلاہٹ ہوئی ، لیکن اُس نے اس کا انتظام کر دیا ۔ کوشلیا ایڈمرل ہاؤس چلی گئی اور میں منٹو کے ساتھ کلیر روڈ پہنچا ۔ میں اس کے بعد دہلی نہیں گیا ۔ پہلے سات دس دن منٹو کے ہاں رہا ، پھر کیڈل کورٹ ، کیڈل روڈ پر ایک رشتے دار کے ہاں اُٹھ گیا ۔

ان سات دنوں میں پہلی باد بمبئی کے مچھر ، منٹو کے فلیٹ کے باہر کا شور اور منٹو کا صبح چار بجے اُٹھ کر پانی بھرنا ہے ۔

پہلی رات منٹو نے میرا بستر بڑے کمرے میں لگا دیا ۔ چارپائیاں اور پلنگ بمبئی میں زیادہ نہیں ہوتے ۔ لوگ زمین پر سوتے ہیں یا فولڈنگ چارپائیوں پر ۔ ایک فولڈنگ بیڈ منٹو نے میرے لیے بچھوا دیا تھا ۔ حالانکہ دسمبر کا مہینہ تھا تو بھی اندر کمرے میں گرمی تھی ۔ مجھے بمبئی کی آب و ہوا کا علم نہ تھا ۔ دلی میں سخت سردی تھی ۔ میں بھاری بستر ساتھ لے گیا تھا ۔ نئی جگہ ، گرم لحاف ، فولڈنگ بیڈ اور پھر مچھر ۔ بڑی رات تک مجھے نیند نہ آئی ۔ اُس وقت ، جب مجھے محسوس ہوا کہ ابھی آنکھ لگی ہے ، اندر کمرے میں کھڑکھڑاہٹ کی آواز آنے لگی ۔ میں جاگ گیا ۔

سوچتا رہا کہ کیا بات ہے ؟ کہیں منٹو کو یا بھابی کو کوئی تکلیف تو نہیں ؟ ایک بار اُٹھ کر اندر کے دروازے تک گیا ، پھر واپس آ گیا ۔ تقریباً آدھ ایک گھنٹے تک یہ آواز آتی رہی ۔ میں اتنا پریشان ہوا کہ دوسرے دن جب منٹو نے فولڈنگ بیڈ بچھایا تو میں نے کہا : "یار ، اندر مجھے نیند نہیں آتی ۔ بیڈ بالکونی میں لگا دو ۔"

اور منٹو نے بیڈ بالکونی میں لگا دیا ۔

لیکن نیند مجھے تب بھی نہ آئی ۔ اندر اگر گرمی کی وجہ سے بے چینی رہی تو بالکونی پر شور کی وجہ سے ۔ منٹو کا مکان سڑک کے نزدیک تھا اور بمبئی میں ادھر آدھی رات تک موٹریں ، بسیں ، ٹرامیں کھڑکھڑاتی رہتی ہیں ، اُدھر علی الصبح اُن کا شور شروع ہو جاتا ہے ۔ میری نیند خاصی کچی ہے ۔ کاغذ کی کھڑکھڑاہٹ بھی اُس میں خلل ڈالنے کے لیے کافی ہے ۔ رات کو کئی بار جاگا اور جب بھی میری آنکھ کھلی میں نے کسی نہ کسی بس ، ٹرام یا موٹر کو رات کے سناٹے کو چیرتے پایا ۔ پھر نہ جانے کس طرح آنکھ لگی ۔ جب اُٹھا تو رات کا آخری پہر تھا ، ہوا میں خنکی تھی ، اندر کچن میں پھر پہلی رات کی طرح کھڑکھڑاہٹ کی آواز آ رہی تھی ۔ سوچنے لگا کیا بات ہے ؟ ضرور کسی کو کوئی تکلیف ہے ۔ لیکن تکلیف ہوتی تو اُس کے آثار منٹو یا بھابی کے چہرے پر دکھائی دیتے اس لیے اُٹھ کر استفسار کرنے کا ارادہ چھوڑ ، چپ چاپ لیٹا رہا ۔ جب تک وہ آواز آتی رہی میں نہ سو سکا ۔ پھر ابھی آنکھ لگی ہی تھی کہ شاید پہلی ٹرام کلیر روڈ کے باسیوں کو صبح کی آمد آمد کی اطلاع دیتی ہوئی کہیں نزدیک سے نکل گئی ۔ اور پھر سونا مشکل ہو گیا ۔ صبح اُٹھا تو محسوس ہوا جیسے جسم کو کسی نے اوکھلی میں رکھ کر کوٹ دیا ہے ۔

ناشتے کے وقت میں نے منٹو سے پوچھا کہ صبح کیا بات تھی ، کیا تم اُٹھے تھے ؟ منٹو نے ایک بڑی سی گالی دیتے ہوئے کہا : "پانی صبح ہی آتا ہے ۔ جب ہم لوگ اُٹھتے ہیں تو اوپر کی منزل ہونے کی وجہ سے اس کی بوند تک نہیں آتی اس لیے میں صبح چار بجے اُٹھ کر دن بھر کی ضرورت کا پانی بھر لیتا ہوں ۔" اور میں جتنے دن وہاں رہا اگرچہ ٹراموں اور بسوں کی آوازوں سے مانوس ہو گیا ، جب منٹو صبح چار بجے اُٹھ کر پانی بھرتا

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

تو ایک بار ضرور میری آنکھ کھل جاتی ۔

اُن سات دنوں کی یاد کے طور پر دوسری بات جو میرے دماغ میں محفوظ ہے وہ تھا منٹو کا دسترخوان ۔ دسترخوان کی جگہ یوں تو وہاں ڈائننگ ٹیبل تھا ، لیکن آداب ، قاعدہ اُس کا دسترخوان ہی کا تھا ۔ چھری کانٹے کا وہاں فقدان تھا ۔ زمین پر بیٹھنے کے بجائے کرسیوں پر بیٹھتے تھے اور بس ۔ صفیہ بھابی کے ہاتھوں کے پکائے ہوئے مرغن پراٹھوں اور سالنوں کی یاد ہمیشہ زندہ رہے گی ۔ منٹو بہت کم کھاتا تھا ۔ زیادہ پینے کی وجہ سے شاید اُس کی بھوک کم ہو گئی تھی لیکن ، گھر میں ہو یا سٹوڈیو میں ، کھانا اُس کے ہاں کا بہت پرتکلف ہوتا تھا ۔ اگرچہ میرا معدہ خراب نہیں لیکن اُن دنوں مجھے وہم تھا کہ وہ خراب ہے اور میں اس بات کا خاص خیال رکھتا تھا کہ میں زیادہ نہ کھا جاؤں ، لیکن اس احتیاط کے باوجود مجھے یقین ہے کہ میں نے ہمیشہ زیادہ کھایا ۔ "

اُن سات دنوں کی تیسری یاد یہ ہے کہ گھر میں شاذ ہی منٹو کبھی ادب کے بارے میں بات کرتا تھا ۔ دوسروں کا تجربہ کیا ہے ؟ میں یہ نہیں جانتا ، لیکن میں نے کبھی اُسے صفیہ بھابی سے اپنی کسی کہانی یا ناٹک کی بات کرتے نہیں دیکھا ۔ منٹو گھر میں خاموش رہتا ہو ، یہ بات نہیں ۔ ادھر اُدھر کی بیسیوں باتیں ، مذاق ، لطیفے ، چٹکلے اُس کی زبان سے جھڑتے رہتے ۔ مذاق — جن میں طنز ہوتا ، باتیں — جن سے اور باتیں نکلتیں اور جن کا ادب سے دور کا بھی واسطہ نہ ہوتا ...... اور میں سوچا کرتا ، اتنی فروعی اور سطحی باتیں کرنے والا کس طرح 'نیا قانون' اور 'ہتک' جیسے گہرے افسانے لکھ سکتا ہے ؟ لیکن جس طرح چیخوف کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ دنیا جہان کی باتیں کرتا تھا لیکن اپنے ادب کی بات آنے پر ٹال جاتا تھا ، اسی طرح منٹو بھی اپنے ادب کی سنگینی کو اپنی بذلہ سنجی میں چھپائے رکھتا تھا — اُس سمندر کی طرح جس کے سینے میں بھیانک طوفان مچلتے ہوں لیکن سطح پر ہلکی ہلکی لہروں کے چھینٹوں کے سوا کچھ نہ دکھائی دیتا ہو ! "

اور اسی طرح منٹو اپنی انسانیت اور انسان دوستی کو اپنی بے تکی ،

اوٹ پٹانگ باتوں ، سوقیانہ لطیفوں ، گالیوں اور شراب نوشی میں چھپائے رکھتا تھا ۔ مجھے منٹو سے ذاتی شکر رنجی کے باعث کئی بار نفرت ہوئی لیکن میں نے جب جب اُس کے افسانے پڑھے میں ہمیشہ اُس کی طرف کھنچا ۔ منٹو کو اپنے افسانے کی تکنیک پر ناز تھا ۔ کرشن نے لکھا ہے :

"منٹو اپنے افسانوں کا لباس نفاست سے تیار کرتا ہے ۔ اُن میں کہیں جھول نہیں آتا ، کہیں کچے ٹانکے نہیں ہوتے — استری شدہ ، صاف ستھرے افسانے ، زبان منجھی ہوئی ، سلیس اور سادہ..." لیکن مجھے منٹو کے افسانے تکنیک کے اسی کمال کی وجہ سے اچھے نہ لگتے تھے ۔ کوئی زمانہ تھا جب ماپاساں کے افسانے پسند آتے تھے لیکن جوں جوں شعور پختہ ہوتا گیا معلوم ہوتا گیا کہ اُن افسانوں کی تکنیک کے کمال میں دراصل بناوٹ مضمر ہے اور جب ویسے دس بیس افسانے ایک ساتھ پڑھے تو وہ بناوٹ ، جو افسانے کے انجام میں نہاں رہتی ہے ، گراں گزرنے لگی اور تب میں نے چیخوف کو پڑھا اور محسوس ہوا جیسے اُس کے افسانے ماپاساں ، ماہم یا او ۔ ہنری کی تکنیک سے یکسر محروم ہیں لیکن اس کے باوجود کہیں زیادہ مؤثر ہیں ۔ افسانہ ختم کرنے پر معلوم ہی نہیں ہوتا کہ ہم نے افسانہ پڑھا ہے ۔ میں نہیں جانتا منٹو پر چیخوف کا اثر تھا یا نہیں لیکن ایک طرف گورکی اور دوسری طرف ماہم اور اُس کی وساطت سے ماپاساں کا اثر اس پر ضرور تھا ۔ لیکن اس کے باوجود اُس کی تکنیک اُس کی اپنی تھی ۔ گورکی سے اس نے انسان دوستی اور پس ماندہ لوگوں کی محبت اور ترقی پسند نقطہ نظر لیا اور ماہم یا ماپاساں سے تکنیک کا کمال لیا لیکن منٹو اگر زندہ رہے گا تو تکنیک کے اس کمال کی وجہ سے نہیں بلکہ اس انسان دوستی کی وجہ سے جو اس کے افسانوں کے رگ و پے میں رچی ہوئی ہے ۔ تکنیک کا وہ کمال ، جس کا اُسے زعم تھا اور جس کا ذکر کرشن نے کیا ہے ، اُس کے افسانوں کو کمزور کر دیتا ہے ۔ مجھے اُس کے افسانے — 'ہتک' ، 'سوراج کے لیے' اور 'ننگی آوازیں' — تینوں بہت اچھے لگے ۔ تینوں کا نقطہ نظر ترقی پسند ہے اور تینوں میں منٹو کی بے پناہ انسان دوستی نہاں ہے لیکن تینوں کے انجام میں تصنع ہے ۔

'ہتک' ہی کو لیجیے ۔ 'ہتک' اس لیے عظیم نہیں کہ ماپاساں کے

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

'نکاس' کی طرح اس کا انجام عظیم ہے۔ 'نکاس' کی وہ آخری لائن کاٹ دیجیے افسانہ ریت کی دیوار کی طرح ڈھے جائے گا۔ لیکن 'ہتک' میں یہ بات نہیں۔ جب سیٹھ سوگندھی کو ناپسند کر کے بے زاری کی ایک "اونہہ" کرتا ہوا موٹر دوڑا کر لے جاتا ہے اور سوگندھی چونکتی ہے، اس کے اندر کی عورت چونکتی ہے — عورت — جو غیر ملوث رہی ہے تو اُس کے بعد افسانہ کہیں بھی ختم ہو سکتا ہے۔

اس لیے سوگندھی گھر آ کر جب مادھو کو دیکھتی ہے تو اُس بے پناہ غصے کے بعد، جسے منٹو نے چار صفحوں میں بیان کیا ہے، ایک سخت فقرہ، گالی یا "اونہہ" جیسی ہی کوئی ہتک آمیز بات کافی تھی۔ وہ اُسے کمرے سے باہر کر کے اُس کے منہ پر تھوک کر دروازہ بند کرتے ہوئے اُسی طرح محوِ حیرت چھوڑ سکتی تھی جیسے وہ سیٹھ اُسے چھوڑ گیا تھا۔ یہ انجام ماہم یا ماپاساں کا ہوتا۔ منٹو ماہم یا ماپاساں نہیں۔ اُسے ڈراماتی انجام پسند ہیں۔ سو وہ باری باری ایک ایک تصویر اُتار کر نیچے بازار میں پھینکتی ہے۔ (حالانکہ حقیقی زندگی میں پہلی تصویر ہی دو منزل اوپر سے کسی کے سر پر گر کر سارا معاملہ گڑبڑ کر سکتی تھی۔)

سوگندھی کو معلوم نہیں کہ مادھو اُس کے ہاں بیٹھا ہے۔ معلوم ہوتا تو وہ اُس سے بدلہ لینے کی اسکیم بناتی کہ وہ پہلے اُس کے کیس کی بات پوچھے گی، پھر اُس کی تصویر باہر پھینکے گی، پھر اُس کا مذاق اُڑاتے ہوئے اُسے باہر نکالے گی۔ (منٹو نے یہ ساری اسکیم اپنے دماغ میں بنا لی تھی، بالکل اُسی طرح جیسے 'خوشیا' میں۔) سوگندھی کے دماغ میں یہ اسکیم نہ تھی لیکن وہ اُسی طرح کرتی گئی جیسے مصنف نے چاہا کہ وہ کرے۔ حقیقی زندگی میں غصہ جب اپنے عروج پر ہوتا ہے اس طرح پھیل کر نہیں نکلتا۔ پھیلنے اور اسکیم بنانے کے لیے وقت چاہیے۔

لیکن انجام کی اس کمزوری کے باوجود 'ہتک' کی عظمت میں شک نہیں۔ اور وہ عظمت اُس کے کنٹنٹ (Content) کی عظمت ہے۔ دو تین سال پہلے الہ آباد کے ترقی پسند مصنفین کی ایک میٹنگ میں نقاد ممتاز حسین نے جب 'ہتک' کے خلاف یہ فتویٰ صادر کیا کہ یہ ترقی پسند افسانہ نہیں تو میں نے مخالفت کی تھی۔ 'ہتک'، 'نئے زاویے' کی پہلی جلد میں شائع ہوا تھا اور

www.pdfbooksfree.pk

ترقی پسند افسانوں میں ممتاز سمجھا گیا تھا۔ ایک وقت جو چیز ترقی پسند سمجھی جائے وہ دوسرے وقت رجعت پسند کیسے ہو سکتی ہے؟ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی — ممتاز حسین صاحب کے سمجھانے کے باوجود!
...... سوگندھی جب گھر کی طرف لوٹتی ہے تو سوچتی ہے:

"اُسے صرف میری شکل پسند نہیں آئی — نہیں آئی تو کیا ہوا؟ — مجھے بھی تو کئی آدمیوں کی شکل پسند نہیں آتی — وہ جو اماوس کی رات کو آیا تھا، کتنی بری صورت تھی اُس کی — کیا میں نے ناک بھوں نہیں چڑھائی تھی؟ جب وہ میرے ساتھ سونے لگا تھا تو مجھے گھن نہیں آئی تھی؟...... کیا مجھے اُبکائی آتے آتے نہیں رک گئی تھی؟ — ٹھیک ہے، پر سوگندھی، تو نے اُسے دھتکارا نہیں تھا، تو نے اُسے ٹھکرایا نہیں تھا —"

نہیں ٹھکرایا تھا، اس لیے کہ وہ ٹھکرا نہ سکتی تھی۔ وہ غلیظ سے غلیظ مرد کے ہاتھ بھی اپنا تن بیچنے پر مجبور تھی اور اسی لیے اُسے نہ اپنے آپ پر غصہ تھا نہ رام لال پر بلکہ سیٹھ پر غصہ تھا۔ (اور یہ غصہ وہی ہے جو مصنف کو ہے۔ مصنف سوگندھی اور رام لال کو اس مہاجنی دور کا شکار سمجھتا ہے اس لیے اُنھیں بے بس اور مجبور سمجھتا ہے اور اُن کے درد و غم سے تلملاتا ہے اور اُس سیٹھ کے خلاف اپنے تمام غصے کا اظہار کرتا ہے کیونکہ اُسے وہ اُس تہذیب کا سمبل سمجھتا ہے۔)

'ہتک' کا یہ پورا افسانے کو انسان کا زبردست المیہ بنا دیتا ہے۔ جب تک یہ نظام رہے گا، جس میں عورت کی یوں ہتک ہوتی رہے گی، وہ اپنا تن چند سکوں کے عوض غلیظ سے غلیظ شخص کے ہاتھ بیچنے پر مجبور رہے گی۔ 'ہتک' کی ترقی پسندی قائم رہے گی۔ خام ترقی پسند نقادوں کے فتووں کے باوجود! یہ نظام بدل جائے گا تو 'ہتک' ایک تاریخی حیثیت حاصل کر لے گا، جسے آنے والی نسلیں بربریت اور بہیمیت کی یاد کے طور پر پڑھا کریں گی۔

"سوراج کے لیے" کا بنیادی خیال بھی انسان کے غیر فطری عزائم اور اُس کے ڈھونگ کے خلاف ایک طنز ہے۔ منٹو نے اس ڈھونگ کا پول

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

نہایت چابک دستی سے کھولا ہے۔ اس کی ایک ایک پرت اُدھیڑ کر رکھ دی ہے۔ لیکن اس افسانے کا انجام بھی کمزور ہے۔ یہ اشارہ، کہ شہزادہ غلام علی ایک فطری فعل کو جس غیر فطری سریقے پر سرانجام دیتا رہا اُس کے ردِ عمل کے طور پر اس نے ربڑ کی چیزیں نہ بیچنے کا مصمم ارادہ کر لیا، اپنی جگہ کافی ہے اور منٹو جس بات کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہے وہ اچھی طرح اُجاگر ہو جاتی ہے لیکن منٹو اسی پر اکتفا نہیں کرتا۔ جس طرح سوگندھی کو غصے میں اس نے سنکی بنا دیا اُسی طرح وہ شہزادہ غلام علی کو نارمل انسان بناتے بناتے سنکی بنا دیتا ہے اور اس افسانے کا اختتام یوں کرتا ہے:

"غلام علی اس کے آگے بھی کچھ کہنے والا تھا کہ اس کا نوکر اندر داخل ہوا۔ اُس کی گود میں شاید غلام علی کا دوسرا بچہ تھا جس کے ہاتھ میں ایک خوشنما بیلون تھا۔ غلام علی دیوانوں کی طرح اُس پر جھپٹا —— پٹاخے کی سی آواز آئی —— بیلون پھٹ گیا اور بچے کے ہاتھ میں دھاگے کے ساتھ ربڑ کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا لٹکتا رہ گیا —— غلام علی نے دو انگلیوں سے اُس ٹکڑے کو چھین کر یوں پھینکا جیسے وہ کوئی مکروہ چیز تھی۔"

یہ انجام افسانے کو مکروہ بنا دیتا ہے اور غیر ضروری ہے۔ غلام علی کو ربڑ کی جس چیز سے نفرت تھی اُس کی طرف منٹو نے ناظر کا دھیان پہلے ہی اس بات کا ذکر کر کے دلا دیا تھا کہ وہ ربڑ کی چیزیں فروخت نہیں کرتا۔ ربڑ کے غبارے کو دیکھتے ہی اُس پر اُس کا جھپٹنا اُسے سنکی بنا دیتا ہے۔ اگر یہ واضح اشارہ دینا ضروری تھا تو پہلے اشارے کی ضرورت نہ تھی۔ پہلے اشارے کے بعد یہ دوسرا اشارہ افسانے کو خام اور شہزادہ غلام علی کو سنکی قرار دیتا ہے۔

لیکن اس خامی کے باوجود یہ افسانہ منٹو کے افسانوں میں ایک امتیازی درجہ رکھتا ہے۔ بنیادی خیال کو اُجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ منٹو نے اُس وقت کی سیاسی زندگی کی ایسی حقیقی تصویر کھینچی ہے کہ بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ شہزادہ غلام علی کوئی حقیقی کردار

ہے یا نہیں؟ اس سلسلے میں یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا لیکن منٹو نے جس دن یہ افسانہ لکھنا شروع کیا اُس سے کچھ دن پہلے یہ خبر جلی حروف میں شائع ہوئی تھی کہ مہاتما گاندھی نے اپنے آشرم میں ایک جوڑے کی شادی اپنے ہاتھوں سرانجام دی اور اُس جوڑے نے شادی کے بندھن میں بندھنے کے بعد یہ اعلان کیا کہ جب تک ہندوستان آزاد نہ ہوگا وہ دوستوں کی طرح رہیں گے۔ مجھے یاد نہیں منٹو نے اس خبر کو پڑھ کر کیا کہا تھا۔ وہ استہزاء سے مسکرایا تھا، اس حماقت پر اس نے کوئی گالی اس جوڑے کو دی تھی؟ اس کے کچھ دن بعد وہ یہ افسانہ لکھنے لگا تھا۔

اس افسانے کے بنیادی خیال پر منٹو پہلے بھی ایک افسانہ "پانچ دن" کے عنوان سے لکھ چکا تھا۔ 'پانچ دن' میں پروفیسر کہتا ہے —— پروفیسر —— جو اپنی طالبات کو اپنی بچیاں سمجھتا تھا:

"میں ایک جھوٹ ہوں، بہت بڑا جھوٹ —— میری ساری زندگی اپنے آپ سے جھوٹ بولنے اور پھر اُسے سچ بنانے میں گزری ہے —— اُف! کتنا تکلیف دہ، غیر فطری اور غیر انسانی کام تھا — میں نے ایک خواہش کو مارا تھا لیکن مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ اس قتل کے بعد مجھے اور بہت سے خون کرنے پڑیں گے۔ میں سمجھتا تھا ایک مسام کو بند کر دینے سے کیا ہوگا؟ لیکن مجھے اس کی خبر نہ تھی کہ مجھے اپنے جسم کے سارے دروازے بند کر دینے پڑیں گے۔"

اسی بنیادی خیال کو اور بھی اُبھار کر منٹو نے "سوراج کے لیے" میں بیان کیا ہے۔ مہاتما گاندھی نے اپنی سوانحِ حیات میں لکھا ہے کہ جب ان کے والد بیمار تھے وہ اپنی نئی بیاہی بیوی کے ساتھ فرائضِ خاوندی سرانجام دے رہے تھے۔ حیرت ہے اس حقیقت کو جاننے کے باوجود اُنھوں نے کیوں دوسروں کے لیے فطری راستوں کو مسدود کرنا مناسب سمجھا؟ اُنھوں نے اپنے ایک بیٹے کو حکم دیا (جو اُن کے دوست کی بیٹی کو چاہتا تھا) کہ اگر تم پانچ سال بعد بھی اس لڑکی کو چاہو گے تو تمھاری شادی کر دی جائے گی اور اُنھوں نے اپنے بیٹے کو کسی دور دراز علاقے میں

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

آزادی کی لڑائی لڑنے کے لیے بھیج دیا ۔ ایک دوسرے آشرم واسی اور آشرم واسنی میں جب محبت ہوئی اور انھوں نے مہاتما گاندھی کا آشیر واد چاہا تو مہاتما گاندھی نے وہی پانچ سال کی قید لگا دی کہ آزادی کے یگیہ میں پانچ سال تک اپنے جذبات کی آہوتی دینے کے بعد بھی اگر تم ثابت قدم رہے تو میں اپنے ہاتھوں تمھاری شادی کر دوں گا ۔

ان کے بیٹے پانچ برس تک ثابت قدم رہے اور مہاتما گاندھی نے اُن کو اپنی محبوبہ سے شادی کی اجازت دے دی ۔ دوسرے بھگت یہ قید برداشت نہ کر سکے اور وہ اپنی محبوبہ کے ساتھ بھاگ گئے ۔

[منٹو کو ان واقعات کا علم نہ تھا ورنہ مجھے یقین ہے کہ وہ ان پر بھی 'سوراج کے لیے' جیسے طنزیہ افسانے لکھتا ۔ جیسا کہ میں اُسے جانتا ہوں ، پہلے افسانے میں مہاتما گاندھی یا ان کے بدل کے طور پر کسی روحانی یا سیاسی گرو کے اس فیصلے کے بعد وہ دکھاتا کہ نوجوان پانچ سال اس لڑکی سے محبت کیے جاتا ہے ، کیونکہ محبت تشنگی میں پلتی ہے ، لیکن چھٹے برس جب اُس کی شادی ہو جاتی ہے اور وہ اُس لڑکی کو روحانی آنکھوں سے نہیں حقیقی آنکھوں سے دیکھتا ہے تو وہ اُس سے سخت نفرت کرنے لگتا ہے ۔ دوسرے قصے پر شاید وہ افسانہ لکھنا پسند نہ کرتا یا جوں کا توں اُسے لکھ دیتا اور دونوں آشرم واسیوں کو بھگا دیتا کہ یہ فطرت کے عین مطابق تھا ۔]

نہ جانے مہاتما گاندھی میں یہ سادیت پسندی کیوں تھی ؟ اپنی جوانی کی یاد کرتے وقت وہ دوسروں کی جوانی کی بات کیوں بھول جاتے تھے ؟ لیکن وہ شاید عوام کی نفسیات کے زبردست عالم تھے اور ہندوستانی عوام کے دلوں کو کس طرح جیتا جا سکتا تھا ، اسے بخوبی جانتے تھے ۔ لیکن منٹو سیاست داں نہیں تھا اور وہ جہاں کہیں انسان کے فطری جذبوں کا خون ہوتے دیکھتا تھا تلملا جاتا تھا ۔ 'سوراج کے لیے' میں اس کی تلملاہٹ دیکھیے ۔ شہزادہ غلام علی کے منہ سے وہ کہلواتا ہے :

"دنیا میں اتنے مصلح پیدا ہوئے ہیں ، ان کی تعلیم کو لوگ بھول چکے ہیں لیکن صلیبیں ، دھاگے ، داڑھیاں ، کڑے اور

بغلوں کے بال رہ گئے ہیں ۔ ایک ہزار برس پہلے جو لوگ یہاں بستے تھے ہم اُن سے زیادہ تجربہ کار ہیں ۔ میری سمجھ میں نہیں آتا آج کے مصلح کیوں خیال نہیں کرتے کہ وہ انسان کی شکل مسخ کر رہے ہیں ۔ جی میں کئی دفعہ آتا ہے ، بلند آواز میں چلانا شروع کر دوں ـــــ خدا کے لیے انسان کو انسان رہنے دو ۔ اس کی صورت تم بگاڑ چکے ہو ، ٹھیک ہے ۔ اب اس کے حال پر رحم کرو ۔ تم اُس کو خدا بنانے کی کوشش کرتے رہے ہو لیکن وہ غریب اپنی انسانیت بھی کھو رہا ہے ..... نفس ہزاروں میں ایک دو آدمی ماریں گے ۔ سب نے اپنا نفس مار لیا تو ، میں پوچھتا ہوں ، یہ کشتہ کس کام آئے گا ؟"

اور جوں ہی انسان کے ان اساسی جذبات کو منٹو اپنے اس افسانے میں اُجاگر کرتا ہے افسانہ عظمت حاصل کر لیتا ہے ۔

"ننگی آوازیں" کا اختتام بھی 'پتک' اور 'سوراج کے لیے' کے اختتام سے مختلف نہیں ۔ افسانے کا بنیادی خیال بھی 'پتک' کی طرح انسان کا ایک دوسرا المیہ بیان کرتا ہے ۔ ایک لمبی چھت پر مہاجرین اپنی اپنی چارپائیوں کے گرد ٹاٹ باندھ کر یعنی اپنی طرف سے پردہ کر کے سوتے ہیں لیکن اُن کے دائیں بائیں شادی شدہ اور غیر شادی شدہ لوگوں کے سونے سے اُن کنواروں پر کیا گزرتی ہے جو اس طرح سونے پر مجبور ہیں ؟ اسی کا خاکا منٹو نے اس افسانے میں کھینچا ہے ـــ 'ننگی آوازیں' کا بھولو بھی خوشیا کی طرح حساس ہے کیونکہ وہ حساس نہ ہوتا تو اُسے اس ماحول میں اپنی نئی بیاہی بیوی کے ساتھ سونے میں کسی طرح کی ہچکچاہٹ نہ ہوتی ۔ (ظاہر ہے خوشیا کی طرح بھولو کے قالب میں بھی منٹو نے اپنی حساس طبع کو ڈال دیا ہے ۔) لیکن افسانہ وہیں ختم ہو جاتا ہے جہاں بھولو کی بھاوج اپنے دیور کی تکلیف کی اصل ماہیت کو نہ سمجھ کر اپنے شوہر سے کہتی ہے کہ وہ فرائض خاوندی سرانجام دینے سے قاصر ہے ـــ افسانے کا المیہ وہاں مکمل ہو جاتا ہے ۔

ساپاساں اس کے بعد ایک لفظ بھی لکھنا گناہ خیال کرتا ہے لیکن منٹو ماپاساں نہیں ۔ وہ اپنا غصہ اس طرح قابو میں نہیں رکھ سکتا ۔ اور

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

اس لیے جہاں اس نے سوگندھی اور شہزادہ غلام علی کو غصے میں نیم دیوالہ دکھایا تھا وہاں بھولو کو بالکل دیوالہ بنا چھوڑا ہے — جو غصے کی اس انتہا پر پہنچ کر کوٹھے پر لگے ہوئے ٹاٹوں کو اکھاڑنے پر ہی اکتفا نہیں کرتا بلکہ سر پر کن کے بانس کی ضرب کھا کر بالکل پاگل ہو جاتا ہے اور منٹو اس افسانے کو یوں ختم کرتا ہے:

"اب وہ الف ننگا بازاروں میں گھومتا پھرتا ہے، کہیں ٹاٹ لٹکتا دیکھتا ہے تو اُس کو اُتار کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے۔"

"لیکن اختتام کی اس خامی کے باوجود اس کہانی کا درد منٹو کی ایک دوسری کہانی "شریفن" کی طرح ناقابل فراموش ہے۔ منٹو کو غصہ ہے — بے پناہ غصہ — کہ انسان، جو احساس کی دولت سے مالامال ہیں، کیوں جانوروں کی طرح زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں۔ اور جب منٹو کو غصہ آئے تو قابو میں رکھنا اُس کے لیے بہت مشکل ہو جاتا ہے اور اسی غصے میں وہ بارہا کہانی کے فن کو بھول کر منکی ہو جاتا ہے۔ 'ہتک'، 'سوراج کے لیے' اور 'ننگی آوازیں' کے یہ ایک جیسے اختتام اُس کے اسی بے پناہ غصے کی چغلی کھاتے ہیں۔ لیکن شاید اسی غصے کی وجہ سے ان کہانیوں میں وہ درد مندی آ گئی ہے جو اُنھیں زندہ جاوید بناتی ہے!"

منٹو اپنے غصے میں ہمیشہ تکنیک کو فراموش کر دیتا ہو، یہ بات نہیں۔ 'شریفن' میں اُس کا غصہ اور درد مندی وہی ہے اور تکنیک سر سے پیر تک درست ہے۔ پنجاب کے فسادات اور بربریت کو دیکھ کر ہر کوئی یہ سوال کرتا ہے کہ یہ کیسے ہوا؟ کیسے مہذب لوگ، ایک دوسرے کو چاہنے والے، ایک دوسرے کو پیار کرنے والے، ایک ساتھ کھانا کھانے اور رہنے والے اس قدر وحشی ہو گئے کہ جنھیں وہ اپنی مائیں اور بہنیں سمجھتے تھے اُنھیں کی عصمت دری پر اُتر آئے؟ منٹو نے 'شریفن' میں اُس کا جواب دیا ہے اور افسانے کی آخری لائن لوہے کی گرم سلاخ کی طرح دل و دماغ پر ہمیشہ کے لیے ایک نشان بنا دیتی ہے۔

میں منٹو کی کہانیوں کو ہمیشہ پسند کرتا رہا ہوں۔ اُس کے غصے اور جھنجھلاہٹ کے لیے میرے دل میں ہمیشہ ہمدردی رہی ہے۔

حالانکہ انسان کے بارے میں اُس کے نقطۂ نظر سے مجھے اتفاق نہیں رہا۔ منٹو، مہاتما گاندھی، بدھ یا عیسیٰ مسیح پر طنز کر سکتا ہے۔ میں اُس کے طنز کو پسند بھی کر سکتا ہوں لیکن یہ ضروری نہیں کہ خود بھی وہ طنز کرنا پسند کروں۔ جب منٹو انسان کے اساسی جذبات کی ترجمانی کرتا ہے تو وہ غلط بات نہیں کرتا، کیونکہ ہماری حیوانیت، خام انسانیت، ہمارے پرورشنز اور ہمارے کردار کی خامیوں کو بتانا غلط نہیں۔ لیکن جب وہ ان کا جواز دیتا ہوا اُن پرورشنز کو (کہیں کہیں) جائز سمجھتا ہے اور انسان کے بنیادی جذبات پر کسی طرح کی قید پسند نہیں کرتا اور چاہتا ہے کہ اس کے بنیادی جذبوں کو کھل کھیلنے کا موقع دینا ہی اُسے انسان بنائے رکھتا ہے (منٹو کی کئی کہانیاں — "ممی"، "پڑھیے کلمہ" وغیرہ اس بات کی نظیر ہیں۔) تو میری رائے میں وہ غلطی پر ہے۔"انسان کے بنیادی جذبے وہی ہیں جو اُس کے جد امجد کے! بنیادی طور پر وہ حیوان تھا اور یہی وجہ ہے کہ جب تہذیب و تمدن کی قیود اُس کے ان بنیادی جذبوں کے اوپر سے ہٹ جاتی ہیں تو وہ اپنے اصلی روپ میں سامنے آ جاتا ہے — خود غرض، خود پرست، کمینہ، لالچی، غصہ ور، نفس پرست، حیوان! اپنے ان بنیادی جذبوں کو دبا کر یا انھیں مسمار کر وہ انسان بنا ہے۔ جس چیز کو آج ہم انسانیت کہتے ہیں — جو بربریت کی متضاد ہے — اُسے اس حیوان نے (جسے ہم آج انسان کہتے ہیں) صدیوں کی محنت سے حاصل کیا ہے اور اُس کے حصول میں اُن بے شمار پیغمبروں، مفکروں، ادیبوں اور شاعروں کا ہاتھ ہے جنھوں نے اپنے بنیادی جذبات کے باوجود فکر و عمل کی وہ راہیں نکالیں جن پر چل کر وہ حیوان انسان بنا۔" منٹو انسانیت پرست ہے، اس لیے جب وہ انسانوں کو حیوانوں جیسے فعل کرتا دیکھتا ہے تو تلملا اُٹھتا ہے۔" لیکن انسان کیوں ایسا کرتے ہیں؟ اُسے کس پر غصہ کرنا چاہیے؟ کس پر اپنے قلم کا وار کرنا چاہیے؟ اُسے معلوم نہیں۔ علی سردار جعفری نے "چغد" کے دیباچے میں، منٹو کے کرداروں پر لکھتے ہوئے، اُس کے اس غصے کا خوب تجزیہ کیا ہے:

"یہ (منٹو نے جن کرداروں کا خاکا اپنی کہانیوں میں کھینچا ہے) کبھی انسان تھے یا ان میں انسان بننے کی صلاحیت تھی،

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

لیکن اس سماج نے ، جس کی بنیاد لوٹ کھسوٹ پر ہے ، ان سب کو جانور بنا دیا ہے ۔ وہ جانور — جن کی صورتیں انسانوں کی سی ہیں — لیکن جو پھر بھی انسان نہیں ہیں ۔ منٹو جھنجھلا جاتا ہے ۔ وہ اُن کی روح کے اندر جھانک کر دیکھتا ہے اور اُسے یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اُن کے سینوں کے اندر انسانی دل دھڑک رہے ہیں ۔

"لیکن اسی سماج نے انسانی کردار بھی پیدا کیے ہیں ۔ یہ وہ ہیں جو اپنی کھوئی ہوئی انسانیت کو حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں ۔ اُن کے چہرے بھی انسانوں کے سے ہیں ، اُن کی روح بھی انسانوں کی سی ہے اور اُن کے دل بھی! جدوجہد نے انہیں اُن کی دولت واپس دے دی ہے ، لیکن منٹو اُن کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتا ۔

"یہی وجہ ہے کہ وہ ادبی دہشت پسندی پر اُتر آتا ہے اور اگر اُس کا بس چلے تو وہ سیاسی دہشت پسندی پر بھی آمادہ ہو جائے ۔"

"منٹو کے افسانے" کے دیباچے میں منٹو لکھتا ہے :

"جب میرے ہاتھ میں پستول ہوگا اور دل میں دھڑکا نہ رہے گا کہ یہ خود بخود چل جائے گا تو میں اسے لہراتا ہوا نکل جاؤں گا اور اپنے اصلی دشمن کو پہچان کر یا تو ساری گولیاں اُس کے سینے میں خالی کر دوں گا یا خود چھلنی ہو جاؤں گا ۔ اس موت پر جب میرا کوئی نقاد کہے گا کہ پاگل تھا تو میری روح اُن لفظوں کو ہی سب سے بڑا تمغہ سمجھ کر اُٹھا لے گی اور اپنے سر پر آویزاں کر لے گی ۔"

لیکن منٹو کو یہ معلوم نہیں کہ انسان کا سب سے بڑا دشمن خود انسان یعنی اُس کے حیوانی جذبے ہیں جنھوں نے بظاہر اس دور میں سرمایہ داری کی شکل لے لی ہے لیکن جو درحقیقت ہمیشہ اُس کے اندر سے باہر نکلنے کو کھلبلی مچاتے رہتے ہیں ۔ انسان کو اپنے اجداد کی طرح

ہمیشہ نبردآزما رہنا ہے ۔ ایک شخص کے سینے میں پستول کی ساری گولیاں ختم کرنے سے اُس دشمن کا خاتمہ نہیں ہو سکتا ۔ یہ لڑائی ازل سے جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گی ۔ انسان نظام کے بعد نظام بدلتا رہے گا اور آخرکار یا تو اپنے حیوانی جذبوں کو ختم کر کے دیوتا بن جائے گا یا خود ختم ہو جائے گا — لیکن جب تک دونوں میں سے ایک چیز نہیں ہو جاتی ، وہ انسان بننے کی کوشش کرتا رہے گا ۔ یہ مسلّم ہے ۔ علی سردار جعفری نے ٹھیک ہی لکھا ہے :

"منٹو اپنے اصلی دشمن کو نہیں پہچانتا اور خالی ہوا میں وار کرتا ہے جس کی چوٹ کسی پر نہیں پڑتی ۔ اس لیے اس کی دہشت پسندی اپنے آخری تجزیے میں خود انسان کے خلاف دہشت پسندی بن جاتی ہے ، جس سے منٹو کو بے انتہا محبت تھی ۔"

لیکن منٹو کے بہترین افسانوں میں اُس کی انسان دوستی ، انسان پرستی اور دردمندی اپنے عروج پر ہے ۔ مندرجہ بالا اقتباس پڑھ کر اُس نے کہا ہوگا :

"سردار مسخرہ ہے ، انسانی دل کی اُن تاریکیوں کا اُسے علم نہیں جن کا پتا میں نے مدت ہوئی پا لیا ہے ۔"

فلمستان کی دو سال کی ملازمت میں چودہ پندرہ ہزار روپیہ میں نے اکٹھا کر لیا تھا ۔ ارادہ تھا ہندی ، اردو دونوں میں پبلشنگ شروع کر دوں گا ۔ منٹو اور میں دونوں فلمستان سے الگ ہو رہے تھے ۔ ایک دن میں نے اُس سے کہا :

"میں ہندی میں پبلشنگ شروع کروں گا تو تمھاری تیس بہترین کہانیاں چھاپوں گا ۔ کتنے فی صدی رائلٹی لوگے ؟"

"رائلٹی وائلٹی چھوڑو ۔" منٹو نے کہا ، "تم پانچ سو آج نقد دے دو پھر چاہے قیامت تک افسانے شائع کرتے رہو ۔"

میں منٹو کے افسانے ضرور شائع کرتا لیکن کچھ ہی دن بعد میں بیمار

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

ہو گیا ۔ ڈاکٹروں نے دق کا فتویٰ دیا اور میں لاہور جانے کے بجائے پنج گنی کے Bel Air سینی ٹوریم میں چلا گیا ۔ گزشتہ پانچ سال سے میں اس کوشش میں ہوں کہ منٹو سے اپنا وعدہ پورا کروں لیکن ابھی تک ممکن نہیں ہوا حالانکہ افسانے ترجمہ کرائے پڑے ہیں ۔ منٹو اتنی جلدی رفاقت یا عداوت چھوڑ کر چل دے گا ، اگر مجھے یہ معلوم ہوتا تو میں اپنی کتابیں چھوڑ کر پہلے اُس کے نمائندہ افسانوں کا مجموعہ ہندی میں شائع کر دیتا ۔

منٹو نے ایک جگہ لکھا ہے :

"بچپن اور لڑکپن میں "میں نے جو کچھ چاہا وہ پورا نہ ہونے دیا گیا ۔ یوں کہو کہ میری خواہشات کچھ اس طرح پوری کی گئیں کہ اُن کی تکمیل میرے آنسوؤں اور میری ہچکیوں میں لپٹی ہوئی تھی ۔ میں شروع ہی سے جلد باز اور زود رنج رہا ہوں ۔ اگر میرا جی کسی مٹھائی کھانے کو چاہا ہے اور یہ چاہ عین وقت پر پوری نہیں ہوئی تو میرے لیے اُس خاص مٹھائی میں کوئی لذت نہیں رہی ۔ ان امور کی وجہ سے میں نے ہمیشہ اپنے حلق میں ایک تلخی سی محسوس کی ہے ، اور اس تلخی کی شدت بڑھانے میں اس افسوس ناک حقیقت کا ہاتھ ہے کہ میں نے جس سے محبت کی ، جس کو اپنے دل میں جگہ دی اُس نے نہ صرف میرے جذبات کو مجروح کیا بلکہ میری اس کمزوری (محبت) سے ناجائز فائدہ بھی اُٹھایا ۔

"جب اس ضمن میں مجھے ہر طرف سے ناامیدی ہوئی — یعنی جس کو میں نے دل سے چاہا اُس نے میرے ساتھ دھوکا کیا — تو میری طبیعت بجھ گئی اور میں نے محسوس کیا کہ میں ریگستان میں ایک بھونرے کی مانند ہوں جسے رس چوسنے کے لیے حدِ نظر تک کوئی پھول نظر نہیں آ سکتا ، لیکن میں اس کے باوجود محبت کرنے سے باز نہ رہا اور حسبِ معمول کسی نے بھی میرے اس جذبے کی قدر نہ کی ۔ جب پانی سر سے گزر گیا اور مجھے میرے نام نہاد دوستوں کی بے وفائیاں

اور سرد مہریاں یاد آنے لگیں تو میرے سینے کے اندر ایک ہنگامہ سا برپا ہو گیا ۔ میرے جذباتی ، سرمدی اور ناطق وجود میں ایک جنگ سی چھڑ گئی ۔ ناطق وجود اُن لوگوں کو ملعون و مطعون گردانتے ہوئے اور گزشتہ واقعات کی افسوس ناک تصویریں دکھاتے ہوئے اس بات کا طالب تھا کہ میں آئندہ کے لیے اپنا دل پتھر کا بنا لوں اور محبت کو ہمیشہ کے لیے باہر نکال پھینکوں ۔ لیکن جذباتی وجود ان افسوس ناک واقعات کو دوسرے رنگ میں پیش کرتے ہوئے مجھے فخر کرنے پر مجبور کرتا تھا کہ میں نے زندگی کا صحیح راستہ اختیار کیا ہے ۔ وہ چاہتا تھا کہ میں محبت کیے جاؤں کہ یہی کائنات کی روحِ رواں ہے ۔

"یہ جنگ خدا جانے کس نامبارک روز شروع ہوئی کہ اب میری زندگی کا ایک جزو بن کر رہ گئی ہے ۔ دن ہو یا رات ، جب کبھی مجھے فرصت کے چند لمحات میسر آتے ہیں میرا ناطق اور جذباتی وجود ہتھیار باندھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں ۔ ان لمحوں میں اگر میرے ساتھ کوئی ہم کلام ہو تو میرا لہجہ یقیناً کچھ اور قسم کا ہوتا ہے ۔ میرے حلق میں ایک ناقابلِ بیان تلخی گھل رہی ہوتی ہے ۔ میں بہت کوشش کرتا ہوں کہ اپنے لہجے کو درشت نہ ہونے دوں اور بعض اوقات اس کوشش میں کامیاب بھی ہو جاتا ہوں لیکن اگر میرے کانوں کو کوئی ناگوار خبر سنائی جائے یا میں کوئی ایسی چیز محسوس کروں جو میری طبیعت کے برعکس خلاف ہو تو پھر میں کچھ نہیں کر سکتا ۔ میرے سینے کی گہرائیوں سے جو کچھ بھی اُبلے زبان کے راستے باہر نکل جاتا ہے ۔ اُس کی تلخی اور درشتی کا احساس مجھے اُس وقت کبھی نہیں ہوا ، اس لیے کہ میں اپنے اخلاص سے ہمیشہ اور ہر وقت باخبر رہتا ہوں اور مجھے معلوم ہوتا ہے کہ میں کبھی کسی کو دکھ نہیں پہنچا سکتا ۔ اگر میں نے اپنے ملنے والوں میں سے یا کسی دوست کو ناخوش کیا ہے تو اس کا باعث میں نہیں ہوں بلکہ

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

یہ خاص لمحات ہیں جب میں دیوانے سے کم نہیں ہوتا......"

منٹو کی کہانی ، جس کا عنوان "ایک خط" ہے ، پڑھتے پڑھتے جب یہ سطریں میری نظر سے گزریں تو مجھے بہت افسوس ہوا کہ میں منٹو سے اُس وقت کیوں نہ ملا جب اُس کا ناطق وجود سویا ہوا تھا اور وہ دوستوں کی بے وفائیوں اور سرد مہریوں سے ناآشنا تھا ، کیونکہ دوستوں کی بے وفائیوں اور سرد مہریوں کا گلہ اُسے ہی نہیں مجھے بھی ہے ۔ ان سطروں کو پڑھتے ہوئے محسوس ہوا کہ منٹو اپنے بارے میں نہیں میرے بارے میں یہ لکھ رہا ہے ۔ فرق صرف اتنا ہے کہ میرے ناطق وجود نے مجھے کبھی اس طرح پریشان نہیں کیا ۔ کسی دیرینہ دوست نے بے وفائی کی ، بے مہری کا سلوک کیا ، تو خواہ تکلیف کتنی بھی کیوں نہ ہوئی ، لہجے میں تلخی نہیں آئی ۔ وجہ یہ ہے کہ جانے کہیں پڑھ کر یا اپنے والد کے اور اپنے تجربوں سے میں نے بہت پہلے دوستی اور محبت کے بارے میں ایک طرزِ عمل اپنا لیا تھا اور وہ یہ کہ دوستی اور محبت یکسر یک طرفہ چیز ہے ۔ میں جسے اپنے دوست کے طور پر چاہتا ہوں ، جس کی قربت سے مجھے سکھ ملتا ہے اُس سے دوستی بنائے رکھنا ، اس سے محبت کرنا میرا کام ہے ۔ جب اس سے محبت کرتے کرتے اس بات کی آرزو ہونے لگتی ہے کہ وہ بھی مجھ سے محبت کرے ، اُسی طرح جیسے کہ میں اُس سے کرتا ہوں ، اور جب ایسا نہیں ہوتا تو بڑی تکلیف ہوتی ہے ۔ پہلے یہ تکلیف بڑی شدت سے ہوتی تھی لیکن اب نہیں ہوتی ۔ میں اُس سے بدستور دل میں محبت کرتا رہتا ہوں لیکن بظاہر خاموش ہو جاتا ہوں ۔ اور چونکہ بغیر محبت کیے نہیں رہا جاتا اس لیے دوستی نبھانے کے لیے کوئی دوسرا چن لیتا ہوں اور میں اپنے آپ کو ایسے پھول سا پاتا ہوں جو رس اور گندھ سے بھرا ہے ۔ اُسے کوئی بھونرا اچھا لگتا ہے تو اپنی خوشبو سے اُسے بلا لیتا ہے ۔ رس اور خوشبو پلاتا ہے ، خوش ہوتا ہے ، لیکن بھونرا چلا جاتا ہے ۔ وہ اس کی یاد دل میں رکھتا ہے اور کسی دوسرے کو بلا لیتا ہے ۔ کبھی کبھی وہ اپنے آپ کو بے حد تنہا اور اُداس پاتا ہے لیکن اُس سکھ کی یاد اُس کے دل کی اُداسی کو دور کر دیتی ہے جو اس نے محبت کا رس اور خوشبو لٹانے میں پایا تھا ......

منٹو نے یہ سطریں بڑے احساس کے ساتھ لکھی ہیں ، اور چونکہ میں نے منٹو کو قریب سے دیکھا ہے اس لیے ان کی حقیقت سے مجھے انکار نہیں ۔ یہ میری بدقسمتی ہے کہ میں منٹو سے اُس وقت ملا جب اُس کا ناطق وجود اس کے حلق کو تلخ اور لہجے کو درشت کر چکا تھا ۔

منٹو ٹھیک کہتا ہے ، وہ دانستہ کسی کو تکلیف نہ پہنچانا چاہتا تھا اور یہی وجہ ہے کہ جب دو بار اُس نے مجھے غصے کی شدت میں گالی دی تو فوراً اُس پر افسوس کا اظہار کر دیا ۔ دونوں بار مجھے محسوس ہوا کہ ہم دونوں بہت اچھے دوست ہو سکتے ہیں ، لیکن ہم بہت دیر میں ملے تھے ۔ جوانی کے شروع میں ملے ہوتے تو یقیناً بہت اچھے دوست ہوتے ۔

بمبئی سے آنے کے بعد منٹو کی زیادہ خبر نہیں ملی ۔ اُس کا ایک خط لاہور سے آیا تھا ، مکتبہ جدید کے لیٹر پیڈ پر کہ وہ محمد حسن عسکری کے ساتھ مل کر ایک پرچہ نکال رہا ہے اور یہ کہ میں اُس کے لیے افسانہ لکھوں ۔ میں اُن دنوں بیمار تھا ۔ جن دوستوں کے بھروسے الہ آباد آیا تھا انھوں نے آنکھیں پھیر لی تھیں اور سخت ذہنی اور جسمانی کش مکش میں مبتلا تھا ۔ لیکن میں نے اُسے یقین دلایا تھا کہ میں افسانہ ضرور لکھوں گا ۔ پھر نہ جانے وہ پرچہ نکلا یا نہیں ، نکلا تو مجھ تک نہیں پہنچا ۔ اتنا یقین ہے کہ اُس کے دو ایک نمبر آتے تو میں جیسے بھی ہوتا اُس کے لیے ضرور افسانہ لکھتا ۔

بس اس خط کے علاوہ بمبئی کی فلمی زندگی کے بعد منٹو سے کسی قسم کی خط و کتابت نہیں ہوئی ۔ ہاں ، جب بھی اُس کا کوئی نیا افسانہ آتا اُس کا ذکر گھر میں ہوتا ، دو ایک دن میں اور کوشلیا اُس کی باتیں کرتے اور پھر زندگی کے تقاضے دوسری باتوں میں اُلجھا لیتے ۔ پھر اچانک اسی جنوری میں سنا کہ منٹو رحلت کر گیا ۔ یکبارگی یقین نہیں آیا ۔ میرے دوست اور پڑوسی بھیرو پرشاد گپت نے مجھے یہ خبر دی ۔ وہ منٹو کے بڑے بھگت ہیں ۔ دس برس ہندی کے سب سے کثیرالاشاعت پرچے "مایا" کی ادارت کر کے اب "کہانی" میں آئے ہیں ۔ وہ 'مایا' میں منٹو کے متعدد افسانوں کے ترجمے شائع کر چکے ہیں اور ابھی کچھ ہی دن پہلے انھوں نے

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"ٹوبہ ٹیک سنگھ" کو ماہانہ "کہانی" کے سالنامے میں شائع کیا تھا جس نے منٹو کا سکہ ہندی کے قارئین کے دلوں پر جما دیا۔

مجھے ناگہاں بھیرو کی بات کا یقین نہیں آیا۔ لیکن انھوں نے کہا کہ "امرت پتریکا" میں خبر چھپی ہے اور ریڈیو سے براڈکاسٹ بھی ہوئی ہے۔ میں نے ریڈیو کے اسسٹنٹ سٹیشن ڈائریکٹر گوپال داس کو فون کیا کہ آیا واقعی ایسی کوئی خبر نشر ہوئی ہے؟ اُن کی لڑکی سخت بیمار تھی۔ اُنھوں نے خبریں نہ سنی تھیں۔ تب میں نے سٹوڈیو فون کیا۔ وہاں ڈیوٹی پر منیر صاحب رہتے ہیں۔ مجھے یقین تھا کہ اُنھیں ضرور معلوم ہوگا، لیکن ابھی ٹرانسمشن شروع نہ ہوئی تھی اور منیر صاحب آئے نہ تھے۔ مگر مجھے چین نہ آیا، چراغ جلے میں نے پھر انھیں فون کیا۔ انھوں نے نہ صرف اس خبر کی تصدیق کر دی بلکہ کہا کہ پاکستان ریڈیو سے آدھ گھنٹے کا پروگرام بھی نشر ہوا ہے۔

تب میں نے آ کر کوشلیا کو بتایا کہ یہ خبر ٹھیک ہے۔ وہ بے ساختہ آنکھیں بھر لائی۔ میرے ہاں اُن دنوں ہندی کی مشہور ادیبہ اور افسانہ نگار کماری کرشنا سوبتی آئی ہوئی تھیں۔ کھانا کھانے کو بالکل جی نہ چاہتا تھا لیکن کچھ بچوں اور کچھ مہمان کے خیال سے کھانے کی میز پر جا بیٹھے۔ میں کھانا کھانے کے بعد اُنھیں منٹو کے بارے میں بتاتا رہا۔

الہ آباد میں منٹو کے جاننے والوں میں "میں اور محمود احمد ہنر تھے۔ کچھ لوگوں نے اُس کا نام سنا تھا اور کچھ نے اُس کے افسانے پڑھے تھے۔ بہرحال بھیرو پرشاد گپت اور ہنر نے مل کر طے کیا کہ منٹو کی اس بے وقت موت پر اظہار افسوس کے لیے اُردو، ہندی ادیبوں کی ایک میٹنگ کی جائے۔

اگرچہ گزشتہ غلط روش کی وجہ سے ترقی پسند ادیبوں میں خاصا انتشار ہے لیکن الہ آباد میں بارہا ترقی پسند کافی تعداد میں مل بیٹھتے ہیں اور خاصے اچھے جلسے ہو جاتے ہیں۔ علی سردار جعفری اور احتشام حسین اور راجندر سنگھ بیدی کے سلسلے میں جو جلسے ہوئے اُن میں خاصے لوگ شامل ہوئے لیکن منٹو کی وفات کے سلسلے میں جو میٹنگ ہوئی وہ کچھ

ایسی بے تکی ہوئی کہ اُس کی تلخ یاد ہمیشہ تازہ رہے گی۔

پہلے میٹنگ میرے یا فراق صاحب کے ہاں کرنے کا ارادہ تھا لیکن پھر، نہ جانے کیسے، جب اس کا اعلان ہوا تو یہ معلوم ہوا کہ میٹنگ چوک کے ایک ایسے پبلشر کے ہاں ہو رہی ہے جو ہندی کے کئی جاسوسی پرچے ایک ساتھ نکالتے تھے اور اب سال بھر سے اردو میں ایک جاسوسی پرچہ نکال رہے ہیں۔ پڑھے لکھے تو خاک نہیں ہیں لیکن اِدھر جب سے اُن کے پاس پیسہ ہو گیا ہے اُن کی بڑی خواہش رہتی ہے کہ دو ایک ادیب اُن کی صحبت میں رہیں۔ اپنی اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے وہ کبھی اس کو یا کبھی اُس کو کافی ہاؤس میں مدعو کرتے رہتے تھے اور ہمیشہ جب بل آتا تو جیب سے سو روپے کا نوٹ نکال کر طشتری میں رکھتے۔

اُن دنوں ہنر صاحب غالباً اُن کے ہاں کام کرتے تھے اس لیے میٹنگ وہیں کرنے کا فیصلہ ہو گیا۔ لیکن بدقسمتی سے صبح سے مُطلع ابر آلود ہو گیا اور دس گیارہ بجے سے بارش ہونے لگی۔ جنوری کا مہینہ اور بارش۔ شام ہوتے ہوتے خوب سردی ہو گئی۔ چھاتے برساتیاں تانے رکشوں پر میں، کوشلیا، کماری کرشنا سوبتی اور کماری دیشی میٹھ اُن پبلشر صاحب کے یہاں پہنچے۔ سائیکلوں پر ہندی کے دو نوجوان افسانہ نگار کملیشور اور دشینت بھی بھیگتے ہوئے ساتھ ہو لیے۔

دوسری منزل پر اُن کا دفتر اور جائے رہائش ہے۔ بارجے پر ٹاٹ کے پردے لگا کر اُنھوں نے دفتر لگا رکھا ہے۔ پردوں کے باوجود سخت ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ تین عورتوں کا ساتھ، میں کچھ دیر سے پہنچا تھا۔ لیکن یہ جان کر تسلی ہوئی کہ ابھی بہت لوگ نہیں آئے۔ صرف "نیا ہند" کے مجیب آئے تھے اور یہ جان کر کہ بارش کے باعث لوگ دیر سے آئیں گے، چلے گئے تھے۔

دفتر کی میزوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے ہم اندر کے بڑے کمرے میں آئے جس میں کچھ جگہ تو چھت تک لگی کتابوں نے گھیر رکھی تھی، باقی حصے میں قالین بچھا تھا اور صوفے پڑے تھے جن کی پشت کا رنگ سیاہ ہو گیا تھا۔ دائیں طرف ایک میز پر ریڈیو پڑا تھا جسے بجانے کے لیے

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

پبلشر صاحب بے چین نظر آتے تھے ۔ درمیان میں ایک گول میز لگی تھی۔ کمرے کی ہر چیز زبانِ حال سے پکار پکار کر صاحبِ خانہ کی کور ذوق کا اعلان کر رہی تھی لیکن باہر کی سردی کے مقابلے میں کمرہ گرم تھا ۔ ہم بیٹھ گئے ۔ ادھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں ۔ جب آدھ گھنٹہ انتظار کرنے کے باوجود ایک بھی اور ادیب نہ پہنچا اور بارش اور بھی زور سے شروع ہو گئی تو میٹنگ شروع ہوئی ۔ میرا نام صدارت کے لیے پیش کیا گیا ۔ موقعے کی سنگینی کے باوجود میں دل ہی دل میں ہنسا ۔ اس میٹنگ میں ہم کیا کہیں گے ، جو اپنے گھر میں نہ کہہ چکے تھے؟ کیونکہ صاحبِ خانہ اور ان کے صاحبزادے کو چھوڑ کر آٹھ میں سے سات لوگ تو میرے ہی ہاں سے آئے تھے !

لیکن میٹنگ شروع ہوئی ۔ ہنر نے منٹو کے ایک مجموعے "یزید" کا آخری مضمون "جیبِ کفن" پڑھنا شروع کیا جو منٹو نے پاکستان میں اپنی ادبی کاوشوں اور وہاں کی ادبی زندگی کے بارے میں لکھا تھا :

"ملک کے بٹوارے سے جو انقلاب برپا ہوا اُس سے میں ایک عرصے تک باغی رہا اور اب بھی ہوں لیکن بعد میں اس خوفناک حقیقت کو میں نے تسلیم کر لیا ۔

"میں نے اس خون کے سمندر میں غوطہ لگایا جو انسان نے انسان کی رگوں سے بہایا تھا اور چند موتی چن کر لایا : عرقِ انفعال کے ، مشقت کے ـــــ جو اس نے اپنے بھائی کے خون کا آخری قطرہ بہانے میں صرف کی تھی ؛ اُن آنسوؤں کے ـــــ جو اس جھنجھلاہٹ میں کچھ انسانوں کی آنکھوں سے نکلے تھے کہ وہ اپنی انسانیت کیوں ختم نہیں کر سکے ... "

ہنر پڑھتے جا رہے تھے اور میری آنکھوں میں "سیاہ حاشیے" کے کئی موتی چمک اُٹھے تھے ۔ اپنے شوق کی سرگرمی میں کسی ترقی پسند نقاد نے اُن کا مذاق یوں اُڑایا تھا کہ "سیاہ حاشیے" میں منٹو نے لاشوں کی جیبوں سے سگریٹ کے ٹکڑے ، انگوٹھیاں اور اسی قسم کی چیزیں نکال کر جمع کی ہیں ۔

میں محسوس کر سکتا ہوں کہ منٹو کو اس تنقید سے کتنی تکلیف ہوئی ہوگی ۔ یقیناً اُس نقاد نے منٹو کی اس روحانی تکلیف کو نہیں سمجھا جس کے زیرِ اثر اُس نے وہ سب "لطیفے" لکھے ۔ اس میں شک نہیں کہ "سیاہ حاشیے" کے بیشتر موتی آبدار نہیں ، اُن میں آنسوؤں کی نمی نہیں ، شک پرستی کی بے آبی ہے لیکن 'حیوانیت' ، 'جوتا' ، 'کسرِ نفسی' اور 'صفائی پسندی' منٹو کی جھنجھلاہٹ ، غصے ، دردمندی اور انسان دوستی کے شاہد ہیں ۔ یوں 'کرامات' ، 'مناسب کارروائی' ، 'صدقے اُس کے' کا طنز بھی ناقابلِ فراموش ہے ۔

" ... میں انسان ہوں ، مجھے غصہ آیا ۔" ہنر پڑھ رہے تھے ، "مجھے غصہ آیا ۔ میں نے اس عالم میں اس کیچڑ کے جواب میں ایسی کیچڑ تیار کی جو بہت دیر تک میرے نام نہاد نقادوں کے چہروں پر جمی رہتی ، لیکن میں نے سوچا اور محسوس کیا کہ ایسا کرنا غلطی ہے ۔ اینٹ کا جواب پتھر سے دینا انسان کی خصلت ہے ، اس میں کوئی شک نہیں ، لیکن خاموش رہنا اُس کی دانش مندی ہے ، اس کا تحمل ہے ، اس کی بردباری ہے..."

اور مجھے راشد کے مذاق کے جواب میں منٹو کا گالیاں دینا اور میری تنقید کے جواب میں اُس کی تلملاہٹ یاد آئی ۔ اس وقت وہ انسان تھا ـــــ اینٹ کا جواب پتھر سے دینے والا لیکن زندگی کے تجربوں نے غالباً اُسے بردبار اور تحمل مزاج بنا دیا ۔ منٹو کی یہ جھانکی میرے لیے نئی تھی ۔ کاش ایسے میں اُس سے میری ملاقات ہوئی ہوتی ۔

اس مضمون کے بعد میں نے ریڈیو اور فلمی زندگی کے سلسلے میں اور منٹو کی کہانیوں کے بارے میں وہی سب کچھ کہا جو میں ہمیشہ کہا کرتا تھا اور جسے سب نے سن رکھا تھا ۔ حالانکہ کوشلیا وہ سب باتیں کئی بار سن چکی تھی لیکن نہ جانے کیوں پھر اُس کی آنکھیں بھر آئیں ۔ جب میں نے اپنی بات ختم کی تو میں نے دیکھا کہ اُس کی آنکھیں پُرنم ہیں اور ناک کچھ زیادہ لمبی لگ رہی ہے ۔ اگر پرمٹ کا جھگڑا نہ ہوتا اور ہم لاہور سے اتنی دور نہ ہوتے تو مجھے یقین ہے کہ کوشلیا اپنی

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

خواہش کے مطابق اس موقعے پر صفیہ بھابی کے پاس لاہور جا پہنچتی۔

وقت زیادہ ہونے لگا تھا۔ میں اُٹھا، کہ صاحبِ خانہ کھیسی نکالتے ہوئے ایک ہاتھ میں چائے کا پیالہ اور دوسرے میں مٹھائی کی طشتری لیے ہوئے آئے۔ ان کے پیچھے پیچھے ان کے صاحبزادے اور نوکر چائے کے پیالے اور طشتریاں لیے ہوئے تھے۔

ایک طشتری انھوں نے میرے سامنے رکھی۔

"مجھے خواہش نہیں۔"

اور وہ چائے کا پیالہ لیے کوشلیا کی طرف بڑھے۔

غصے سے کوشلیا اُٹھ کھڑی ہوئی۔ رونے کی وجہ سے لال آنکھیں غصے سے تمتما رہی تھیں۔ "یہ کوئی موقع ہے چائے پینے کا؟" اُس نے کہا اور باہر کی طرف بڑھی۔

"آپ پہلی بار آئے تو کیا منہ بھی میٹھا نہ کیجیے گا...؟" 'ہیں، ہیں' کرتے ہوئے انھوں نے کہا۔

اور میں سوچنے لگا کہ منٹو ایسے موقعے پر ہوتا تو اُن کے ایسے پرخچے اُڑاتا کہ طبیعت صاف ہو جاتی، لیکن میں نے اُن کے کندھے کو تھپتھپاتے ہوئے سمجھایا کہ پھر کبھی میٹنگ رکھیے گا تو ڈٹ کر کھائیں گے۔

اور ہم سب چلے آئے۔ بہانی کو جیسے اُسی روز پرسنا تھا۔ ایسا پڑ رہا تھا کہ پھر کبھی موقع نہ ملے گا۔

اس میٹنگ کے تین چار روز بعد کی بات ہے۔ صبح میں اپنی میز پر آ کر بیٹھا تو ۳۱۔ جنوری کا "آئینہ" میری میز پر پڑا تھا۔ صفحے پلٹتے ہوئے اچانک سیاہ حاشیوں سے گھرے کرشن چندر کے مضمون پر نظر گئی: سعادت حسن منٹو ــــ خالی بوتل، بھرا ہوا دل۔ ایک ہی نظر میں سارا مضمون پڑھ گیا۔ بڑے احساس کے ساتھ کرشن نے مضمون لکھا ہے۔ اگر اُس کا انجام افسانوی نہ ہوتا تو اور بھی اچھا لگتا۔ کرشن کی یہ

عادت ہے، اور اس کے لیے اس کا بے پناہ تخیل ذمہ دار ہے، کہ وہ حقیقت کے ساتھ افسانہ ملا دیتا ہے۔" لیکن اس خامی کے باوجود مجھے مضمون بہت پسند آیا اور میں نے جا کر کوشلیا سے کہا: "کرشن نے منٹو پر بہت اچھا مضمون لکھا ہے۔" کوشلیا کرشنا سوبتی کے ساتھ باہر باغیچے میں بیٹھی دھوپ لے رہی تھی۔ اُس نے فرمائش کی کہ میں مضمون اسے سنا دوں۔

میں اندر سے "آئینہ" اُٹھا لایا اور چارپائی کی پٹی پر بیٹھ کر مضمون سنانے لگا۔ اچانک جب آدھا مضمون ختم کر کے ان سطروں پر پہنچا: "منٹو ۴۲ سال کی عمر میں مر گیا۔ ابھی اس کے کہنے اور سننے کے دن تھے ــــ ابھی ابھی زندگی کے تلخ تجربوں نے، سماج کی بے رحمیوں نے، مروجہ نظامِ زندگی کے تضاد نے اس کی بے تحاشا انفرادیت اور طرفداری ختم کر کے اُس سے "ٹوبہ ٹیک سنگھ" جیسی کہانی لکھوائی تھی۔ غم منٹو کی موت کا نہیں ــــ موت ناگزیر ہے ــــ غم اُن ناتخلیق کردہ شہ پاروں کا ہے جو صرف منٹو ہی لکھ سکتا تھا..." کہ میرے گلے میں عجیب سی بھرّاہٹ پیدا ہوئی اور پڑھنا میرے لیے مشکل ہو گیا۔ دراصل یہ بھرّاہٹ اُسی وقت پیدا ہو گئی تھی جہاں کرشن نے لکھا ہے: "آل انڈیا ریڈیو بھی کھلا ہے، میڈن ہوٹل کا بار بھی، اُردو بازار بھی ــــ کیونکہ منٹو ایک بہت معمولی آدمی تھا۔ وہ ایک غریب ادیب تھا۔ وہ وزیر نہ تھا کہ کہیں کوئی جھنڈا اُس کے لیے سرنگوں ہوتا...... وہ ایک ستائی ہوئی زبان کا غریب اور ستایا ہوا ادیب تھا ــــ" لیکن میں بڑی کوشش سے اُس بھرّاہٹ کو روک کر مضمون سنائے جا رہا تھا۔ مگر یہاں تک پہنچتے پہنچتے اچانک پڑھنا مشکل ہو گیا۔ میں پڑھ رہا تھا: "اُردو ادب میں اچھے اچھے افسانہ نگار پیدا ہوئے لیکن منٹو دوبارہ پیدا نہیں ہوگا اور کوئی اُس کی جگہ لینے نہیں آئے گا۔ یہ بات میں بھی جانتا ہوں اور راجندر سنگھ بیدی بھی، عصمت چغتائی بھی، خواجہ احمد عباس بھی اور اوپندر ناتھ اشک بھی......" اور آنسو بے اختیار میری آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔ کچھ اور سطریں اُسی حالت میں میں نے پڑھیں: "ہم سب لوگ ــــ اُس کے رقیب، اُس کے چاہنے والے، اُس سے جھگڑا کرنے والے، اُس سے پیار کرنے والے، اُس سے نفرت کرنے والے، اُس سے محبت کرنے والے ــــ رفیق اور ہم سفر تھے اور

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

آج جب وہ ہم میں نہیں ہے ، ہم میں سے ہر ایک نے موت کے شہپر کو اپنے شانے پر محسوس کیا ہے ۔" ...... آنسوؤں نے بینائی کو ڈھک لیا ۔ اخبار کو وہیں پھینک کر میں اندر اپنے کمرے میں چلا گیا اور پھر شام تک باہر نہیں آیا ۔

آج جب میں اس دن کو یاد کرتا ہوں تو مجھے حیرت ہوتی ہے ۔ میرے والد نے میرے دیکھتے دیکھتے آنکھیں بند کی تھیں ، میں نہ رویا تھا ۔ والد سے تو خیر مجھے محبت نہ تھی ، لیکن میری ماں جب مریں تو بھی آنسو میری آنکھوں میں نہ آئے اور اب اس مضمون کو پڑھتے ہوئے ، جسے میں خام سمجھتا تھا ، بے اختیار میری آنکھوں میں آنسو آ گئے ـــــ اور منٹو میرا رشتہ دار نہ تھا ، بھائی نہ تھا ، دوست نہ تھا ـــــ میرا دشمن تھا !

۵- اپریل ۱۹۵۵ع

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk